بُستانِ ادب

اردو اختیاری

9-10



پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ



صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جنرل پرویز مشرف کا پیغام

کسی ملک کی ترقی کا انحصار اس کے عوام کے تعلیمی معیار پر منحصر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان دانشوروں، فلسفیوں اور سائنسدانوں نے اپنے علم کی بدولت کئی سو سال تک دُنیا پر اپنی عظمت کا سکّہ جمائے رکھا۔ ان کی لکھی ہوئی کُتب مغرب کی یونیورسٹیوں میں صدیوں تک بطور نصاب رائج رہیں۔ مسلمان جب تک اس فرمانِ رسالتؐ کے مطابق "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے"۔ رائج علوم سے استفادہ اور اس میں تحقیق کرتے رہے وہ دُنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ اسلامی روایات کے مطابق پاکستان کے نونہالوں کو زندگی کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں حصولِ علم کے لیے وقف کرنا ہونگی اور انہیں جدید سائنسی علوم بالخصوص کمپیوٹر کے استعمال اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا ہوگی تاکہ مستقبل میں ہمارا ملک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہو کر اقوامِ عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکے۔

اس وقت ترقی یافتہ دنیا کے جدید تقاضے ہیں جنہیں ہمارا رائج الوقت نصاب پورا نہیں کر رہا تھا۔ موجودہ حکومت نے جہاں ملکی بقا اور سالمیت کو اہمیت دی وہاں تعلیم کے معیار اور اس کے نصاب کو دورِ حاضر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا انقلابی بیڑا بھی اٹھایا اور عصرِ حاضر کی ضروریات کے مطابق درسی کُتب تیار کروائیں۔

عزیز طلبہ و طالبات!

اب یہ آپ کا فرض ہے کہ انتھک محنت اور لگن سے حصولِ علم کی طرف توجہ دیں تاکہ آپ بڑے ہو کر اس ملک کے ذمہ دار شہری بن کر پاکستان کی ترقی کے لیے ہمہ وقت کام کر سکیں۔

آپ سب کے لیے پاکستان کا مفاد ہر حالت میں مقدم ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین!



وزیراعلیٰ (پنجاب) کا پیغام

عصرِ حاضر علمی ترقی کی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ ترقی یافتہ اقوام کا طرۂ امتیاز اعلیٰ تعلیمی معیار ہے۔ اس مقصد کے حصول میں نصاب اور درسی کتب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جن کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہماری حکومت کا تعلیمی میدان کو فوقیت دینا ثابت کرتا ہے۔ نصاب کی ازسرنو تشکیل کے ساتھ ساتھ درسی کتب کی تصنیف وتدوین میں بھی ہم نے کُہنہ مشق ماہرین کی خدمات حاصل کیں جو اعلیٰ معیارِ تعلیم کے حصول میں یقیناً ممد و معاون ہوں گی۔

عزیز طلبہ وطالبات! زندگی کے اعلیٰ معیار کے حصول میں علمی ترقی اور اعلیٰ معیار بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہماری حکومت اس بنیاد کی فراہمی کے لیے مقدور بھر کوششیں کررہی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ ان نصابی کتب سے استفادہ کریں اور پاکستان کی تعمیروترقی میں بھرپور کردار ادا کریں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ ہماری نسلِ نو جدید تعلیمی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔ آمین

چودھری پرویز الٰہی
وزیراعلیٰ پنجاب

بُستانِ ادب

برائے

جماعت نہم و دہم





پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

تیار کردہ: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

مؤلفین :

پروفیسر طلعت نایاب زیدی

پروفیسر امجد علی شاکر

اشتیاق احمد

ایڈیٹر : ڈاکٹر علی محمد خاں

پروسیسنگ: ملک سلطان محمود۔ آئی جی سکین

ناشر : ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی (پرائیوٹ) لمٹیڈ، لاہور

مطبع : آر۔ ایم۔ ایس پرنٹرز، لاہور

فہرست
(حصہ نثر)

مضامین:

شخصیت نگاری:

سفرنامہ:

مکتوب نگاری:

(حصہ نظم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ

''اردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''لشکر'' یا ''لشکر گاہ'' کے آتے ہیں اور مغلوں کے دور میں لشکر اور اس سے متعلق آبادی کو ''اردو'' کہا جاتا تھا۔ بادشاہی قلعہ اور اس کے متعلقات کو ''اُردوئے معلّٰی'' کہتے تھے چنانچہ اس زبان کو بھی مختلف ناموں سے یاد کیا جانے لگا اور علاقائی نسبتوں کے لحاظ سے ''ہندی''، ''ہندوستانی''، ''گجراتی''، ''دکنی'' اور ''ریختہ'' کے نام دیے گئے لیکن جو نام ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ مخصوص ہو گیا وہ ''اردو'' ہے۔

بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اس زبان کے نشو و ارتقا کے لیے علما، صوفیا اور درویشوں نے بہت کام کیا ہے جن کے اردو ہندی اشعار اس زبان کی ترقی میں مددگار ہوئے۔ ان میں امیر خسرو اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا اور ترقی میں شمالی ہند پر دکن کو فوقیت حاصل ہے جس کے آثار بہمنی دور کے صوفیاء کی تحریروں اور شاعری میں ملتے ہیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق نظامی کو اپنے دیوان ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے حوالے سے اُردو کا پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے مگر مجموعی طور پر ولی دکنی کو اردو شاعری کا ''باوا آدم'' کہا جاتا ہے جس کی شاعری اور زبان میں مقامی اثرات کم ملتے ہیں۔ ولی کی شمالی ہند میں آمد (۱۷۰۰ء) سے پہلے فارسی کے مقابلے میں اردو کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن ولی کے دہلی آنے کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے شاعروں نے اردو کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا جن میں خان آرزو، مرزا مظہر جانِ جاناں اور شاہ حاتم کے نام کافی مشہور ہیں۔ بعد ازاں میر درد، میر تقی میر اور سودا جیسے عظیم شاعر اُردو شاعری کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔

جب دہلی میں مغل سلطنت کا زوال اور انتشار اپنے آخری مراحل طے کر رہا تھا تو سودا و میر بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔ لیکن یہاں اردو شاعری کی اس روایت کو ترقی ہوئی جس کی بنیادی خصوصیت، خارجیت، معاملہ بندی اور حسن و عشق کا ابتذال کی حد تک اظہار ہے۔ اس دور کے شاعروں میں انشا، جرات، مصحفی، ناسخ اور آتش بہت شہرت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اردو غزل کی روایت کو ترقی دی اور زبان میں نکھار پیدا کیا۔ لکھنؤ میں اعلیٰ پایہ کی مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں جن میں میر حسن کی ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزارِ نسیم'' انتہائی اہم اور مشہور ہیں۔ علاوہ ازیں لکھنؤ میں مرثیے کی روایت

نے بھی بہت ترقی کی اور اردو کو انیس اور دبیر جیسے اعلیٰ پائے کے مرثیہ نگار میسر آئے جن کے مرثیے دوسری زبانوں کی رزمیہ شاعری کے مقابلے میں بڑے فخر سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس دور میں آگرے میں ہمیں ایک ایسا شاعر نظر آتا ہے جو ان دونوں ادبی مراکز یعنی دہلی اور لکھنؤ کی روایات سے الگ تھلگ ہے۔ اسے نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۵-۱۸۳۰ء) کہتے ہیں۔ اس کی شاعری نظم گوئی پر مشتمل ہے اور مقامی رسوم و رواج، تہواروں اور موسموں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے شعرا میں بہادر شاہ ظفر، ذوق، غالب اور مومن کے نام نمایاں ہیں لیکن اس دور کا نمائندہ شاعر غالب ہے جس نے اردو کو زبان و بیان کا بہترین نمونہ ہی نہیں بلکہ اردو شاعری کو اپنے عہد اور شخصیت کی ترجمان بنا دیا ہے۔

جہاں تک اردو نثر کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے تو یہ انگریزوں کی دلچسپی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انگریزوں کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ اپنی کمپنی کے انگریز ملازموں کو مقامی لوگوں کی زبان سکھائیں تاکہ وہ اپنے فرائض اچھی طرح سے ادا کر سکیں اور لوگوں کے ساتھ ان کا ربط و ضبط بڑھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم کیا اور اس میں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قائم کیا جہاں ڈاکٹر گلکرسٹ کی نگرانی میں اردو نثر کی کتابیں لکھوائی گئیں۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' اور حیدر بخش حیدری کی ''آرائش محفل'' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اردو نثر کی تشکیلِ جدید میں ''خطوطِ غالب'' کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ خطوط ''عود ہندی''، ''اردوئے معلیٰ'' اور ''مکاتیب غالب'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، رواں اور شگفتہ ہے۔

سیاسی اور تمدنی زوال کے اعتبار سے ۱۸۵۷ء کا سال بڑا اہم ہے۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے اور انگریز حکومت کی بنیاد نے برصغیر کی معاشرتی، تمدنی، مذہبی اور سیاسی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ آزادی کی ناکامی سے مسلمان راہنماؤں کو بہت صدمہ پہنچا اور ان کو یہ احساس بھی ہوا کہ اگر انھیں ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو جدید دور کے جدید تقاضوں کو سمجھنا ہوگا۔ چنانچہ اس احساس کے زیر اثر برصغیر میں بہت سی اصلاحی تحریکیں چلیں جنھوں نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ ان تحریکوں میں سرسید کی ''علی گڑھ'' تحریک بہت اہم ہے اور دوسری تحریک جس نے پنجاب اور اس کے ادب کو متاثر کیا وہ ''انجمن پنجاب'' ہے۔

اصلاحی تحریکوں، انگریزی زبان و ادب کی تعلیم اور جدید سیاسی و سماجی تصورات کی اشاعت سے نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ سامنے آیا جس نے ادب اور شاعری میں پرانی اور فرسودہ روایات کو چھوڑ کر جدید شعری روایات کو فروغ دیا اور سر عبدالقادر کا رسالہ ''مخزن'' ان جوانوں کے خیالات کی اشاعت کا علمبردار بن گیا چنانچہ اس دور کے شاعروں میں اقبال، چکبست، محروم، جوش، حفیظ اور اختر شیرانی بہت اہم ہیں

اور نثر نگاروں میں یلدرم، نیاز فتح پوری، ابوالکلام آزاد، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، سر عبدالقادر، عبدالرحمٰن بجنوری، چودھری افضل حق اور مہدی افادی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں اردو میں مختصر افسانے کا آغاز ہوا جس نے ادب کو زندگی کے قریب کر دیا۔ چنانچہ پریم چند وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے قوم پرستی اور رومانویت کے زیر اثر قلم اٹھایا اور دیہاتی زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویریں پیش کیں۔ ان کے افسانوں میں ''زادراہ'' اور ''واردات'' کے مجموعے بہت اہم ہیں۔ پریم چند نے صرف افسانے ہی نہیں لکھے بلکہ ناول بھی لکھے ہیں جن میں ''میدان عمل'' اور ''گئودان'' کافی شہرت کے حامل ہیں۔

۱۹۳۵ء میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی جس نے اردو ادب اور ادیبوں کو بہت متاثر کیا۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھنے والے ادیبوں میں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری اور سعادت حسن منٹو قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں فیض احمد فیض، مجاز اور ساحر لدھیانوی کے نام کافی شہرت رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے ساتھ اس تحریک میں ایک قسم کا توازن پیدا ہوا اور جو نئے لکھنے والے سامنے آئے ان میں قرۃ العین حیدر، غلام عباس، انتظار حسین، حسن عسکری، صلاح الدین احمد اور میرزا ادیب کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاعروں میں ن۔م۔ راشد، میراجی، تصدق حسین خالد، مجید امجد، ناصر کاظمی اور ابن انشا سے کوئی شخص بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا۔

یوں تو ڈراما بہت پرانی صنف ادب ہے لیکن اردو میں اس کی ابتدا واجد علی شاہ کے عہد (۱۸۴۷-۱۸۵۶ء) میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے عہد میں سید آغا حسین امانت نے ایک ڈراما ''اندر سبھا'' کے نام سے لکھا۔ جسے پہلی دفعہ عوام کے سامنے اسٹیج پر پیش کیا گیا یہی وجہ ہے کہ اسے اردو کا پہلا ڈراما کہتے ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں آغا حشر نے اردو ڈرامے کو ایک نیا انداز اور آہنگ دیا اور وہ ایک نامور ڈراما نگار کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کے بعد سید امتیاز علی تاج نے ڈرامے کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش کی۔ طویل اور مختصر دونوں طرح کے ڈرامے لکھے۔

برصغیر میں ریڈیو کے شروع ہونے کے ساتھ ہی دوسرے ادیبوں نے بھی ڈرامے لکھے جو ریڈیو سے نشر کیے جاتے تھے ان میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی اور میرزا ادیب کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ میرزا ادیب ٹی۔ وی ڈراما نگاروں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، اصغر ندیم سید، امجد اسلام امجد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو زبان و ادب کی روایت کو ترقی دینے اور اس کو اجاگر کرنے میں تحقیق و تنقید کرنے والوں کو ہر دور میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں اردو ادب کی روایت بہت

مضبوط ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیق وتنقید کے میدان میں کام کرنے والوں کی اردو ادب میں کمی نہیں۔ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، وحید الدین سلیم، حافظ محمود شیرانی، سید عبداللہ، گیان چند جین، نورالحسن ہاشمی، حامد حسن قادری، محی الدین زور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر حسن اختر، فرمان فتح پوری، مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، شیخ عبدالقادر، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، کلیم الدین احمد، حسن عسکری اور ڈاکٹر وزیر آغا کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت بہت پرانی ہے اور اس کی ابتدا جعفر زٹلی سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سودا کی شاعری میں مزاح ملتا ہے۔ سودا کے بعد صحت مند اور خوشگوار ظرافت کے آثار ہمیں خطوطِ غالب میں ملتے ہیں۔

غالب کے بعد طنز ومزاح کی روایت کو ''اودھ پنچ'' نے کافی ترقی دی ہے اور منشی سجاد حسین کی ادارت میں بہت سے مزاحیہ اور طنزیہ ادب پارے اس میں چھپے ہیں۔ منشی سجاد حسین کے ساتھیوں میں سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق اور اکبرالہ آبادی کے نام بہت نمایاں ہیں۔

''اودھ پنچ'' کے دور کے بعد جن لوگوں نے طنز ومزاح کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کو سند کا درجہ حاصل ہے ان کے مضامین کے مجموعے چھپ چکے ہیں جو ''مضامین فرحت''، ''مضامین پطرس'' اور ''مضامین رشید'' کے ناموں سے ملتے ہیں۔ ان کے بعد عظیم بیگ چغتائی کا ''کولتار'' شوکت تھانوی کی ''سودیشی ریل'' اور امتیاز علی تاج کی کتاب ''چچا چھکن'' بہت مقبول ہوئیں۔ دور حاضر کے لکھنے والوں میں ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن، ضمیر جعفری اور کرنل محمد خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔

داستان

داستان کہانی کی سب سے قدیم اور اولین قسم ہے۔ ایک معیاری داستان میں عام طور سے مندرجہ ذیل اجزا ہوتے ہیں۔ پلاٹ، تخیل اور رومان، مافوق الفطرت عناصر، مثالی کردار، خطابت، رنگینی بیان اور تحیر انگیزی۔ داستانوں کے اندر ایک وسیع وعریض اور عجیب وغریب دنیا آباد ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان بھی داستانوں سے خالی نہیں۔ اردو زبان اور شاعری کی طرح اردو داستان کا بھی عربی اور فارسی داستان سے گہرا تعلق ہے۔ داستانیں ہمارے سامنے قدیم دور کے ماحول، معاشرت، رسوم و رواج، عقائد ونظریات اور طور طریقوں کو پیش کرتی ہیں۔ داستانوں سے اخلاقی سبق ملتے ہیں۔ ان میں حق گوئی و بے باکی، سخاوت، ایثار، شجاعت اور عزم و ہمت کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ داستانیں قدیم طرزِ تحریر کے خوبصورت نمونے پیش کرتی ہیں۔ جدید ناول اور مختصر افسانے کے ارتقائی سفر میں داستان پہلا سنگ میل ہے۔

ملا وجہی کی سب رس، میر حسین عطا تحسین کی نوطرز مرصع، حیدر بخش حیدری کی توتا کہانی اور آرائشِ محفل، میر امن دہلوی کی باغ وبہار، رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب اردو کی مشہور داستانیں ہیں۔

(۱۷۳۳ء-۱۸۱۲ء)

میر امن دہلوی

میر امن دہلی کے رہنے والے تھے۔ آباؤ اجداد ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ جب دہلی کی بادشاہت ختم ہوئی تو اس وقت میر امن نے ہوش سنبھالا۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ مارے مارے پھرتے رہے۔ حتیٰ کہ تلاش معاش کے سلسلے میں عظیم آباد چلے گئے، مگر روزگار نہ مل سکا۔ اس لیے وہاں سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ یہاں فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے منشی کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔ بعد میں ان کے کہنے پر آپ نے اپنی مشہور کتاب "باغ و بہار" لکھنا شروع کی جو ایک سال میں مکمل ہوئی۔

میر امن کی باغ و بہار ایک لافانی ادبی شاہکار بن گئی ہے۔ پونے دو سو سال کی مدت گزرنے کے باوجود اس کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قصہ ترجمہ ہے، مگر اس پر طبع زاد ہونے کا گماں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کی زبان کی سادگی، روانی اور شگفتگی ہے۔ یہ ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کی ضمانت ہے۔

سرگزشت آزاد بخت پادشاہ کی

جب دوسرا درویش بھی اپنی سیر کا قصہ کہہ چکا، رات آخر ہوگئی اور وقت صبح کا شروع ہونے پر آیا۔ پادشاہ آزاد بخت چپکا اپنے دولت خانے کی طرف روانہ ہوا۔ محل میں پہنچ کر نماز ادا کی۔ پھر غسل خانے میں جا کر، خلعت فاخرہ پہن کر، دیوان عام میں تخت پر نکل بیٹھا اور حکم کیا کہ ”یساول جاوے، چار فقیر فلانے مکان پر وارد ہیں، ان کو بہ عزت اپنے ساتھ حضور میں لے آوئے۔“ پادشاہ دیوان خاص میں جا بیٹھے، اور دو چار خاص امیروں کو بلایا، اور فرمایا کہ ”چاروں گدڑی پوشوں کو بلاؤ۔“ جب وہاں گئے، حکم بیٹھنے کا کیا۔ احوال پرسی فرمائی کہ ”تمھارا کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے؟ مکان مرشدوں کے کہاں ہیں؟“

انھوں نے کہا کہ ”پادشاہ کی عمر و دولت زیادہ رہے! ہم فقیر ہیں۔ ایک مدت سے خانہ بدوش اسی طرح سیر و سفر کرتے پھرتے ہیں۔ وہ مثل ہے: فقیر کو جہاں شام ہوئی، وونہیں گھر ہے اور جو کچھ اس دنیائے ناپائدار میں دیکھا ہے، کہاں تک بیان کریں؟“

آزاد بخت نے جب دیکھا کہ اب ان میں مارے رعب کے حواس نہیں رہے جو کچھ بولیں، فرمایا کہ ”اس جہاں میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس پر ایک نہ ایک واردات عجیب و غریب نہ ہوئی ہو گی، باوجودیکہ میں پادشاہ ہوں لیکن میں نے بھی ایسا تماشا دیکھا ہے کہ پہلے میں ہی اس کا بیان کرتا ہوں۔ تم بہ خاطر جمع سنو۔“ درویشوں نے کہا۔ ”پادشاہ سلامت! آپ کا الطاف فقیروں کے حال پر ایسا ہی ہے۔ ارشاد فرمایئے۔“

آزاد بخت نے اپنا احوال شروع کیا، اور کہا:

میرے قبلہ گاہ نے جب وفات پائی اور میں اس تخت پر بیٹھا، عین عالم شباب کا تھا اور سارا یہ ملک روم کا میرے حکم میں تھا۔ اتفاقاً ایک سال کوئی سوداگر بدخشاں کے ملک سے آیا، اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔ خبرداروں نے میرے حضور میں خبر کی کہ ایسا بڑا تاجر آج تک شہر میں نہیں آیا۔ میں نے اس کو طلب فرمایا۔

وہ تحفے ہر ایک ملک کے، لائق میری نذر کے، لے کر آیا۔ فی الواقع، ہر ایک جنس بے بہا نظر آئی۔ چنانچہ ایک ڈبیا میں ایک لعل تھا، نہایت خوش رنگ اور آبدار، قد و قامت درست اور وزن میں

پانچ مثقال کا۔ میں نے باوجود سلطنت کے ایسا جواہر کبھو نہ دیکھا تھا اور نہ کسو سے سنا تھا۔ پسند کیا۔ سوداگر کو بہت سا انعام و اکرام دیا اور سند راہ داری کی لکھ دی کہ اس سے ہماری تمام قلمرو میں کوئی مزاحم محصول کا نہ ہو، اور جہاں جاوے اس کو آرام سے رکھیں۔

میں اس لعل کو ہر روز جواہر خانے سے منگوا کر سرِ دربار دیکھا کرتا۔

ایک روز دیوان عام کیے بیٹھا، اور امرا و ارکان دولت اپنے اپنے پائے پر کھڑے تھے اور ہر ملک کے پادشاہوں کے ایلچی مبارک باد کی خاطر جو آئے تھے وہ بھی سب حاضر تھے۔ اس وقت میں نے موافق معمول کے، اس لعل کو منگوایا، جواہر خانے کا داروغہ لے کر آیا، میں ہاتھ میں لے کر تعریف کرنے لگا اور فرنگ کے ایلچی کو دیا۔

اس وقت میرے قبلہ گاہ کا وزیر کہ مرد دانا تھا اور اسی خدمت پر سرفراز تھا، وزارت کی چوکی پر کھڑا تھا، آداب بجا لایا اور التماس کیا کہ ”کچھ عرض کیا چاہتا ہوں اگر جان بخشی ہو۔“

میں نے حکم دیا کہ ”کہہ!“۔ وہ بولا ”قبلۂ عالم! آپ پادشاہ ہیں اور پادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک پتھر کی اتنی تعریف کریں۔ اگرچہ رنگ، ڈھنگ میں لاثانی ہے، لیکن سنگ ہے۔ خداوند! ایک ادنیٰ سوداگر نیشا پور میں ہے، اس نے بارہ دانے لعل کے کہ ہر ایک سات سات مثقال کا ہے، پٹے میں نصب کر کر کے کتے کے گلے میں ڈال دیے ہیں۔“ مجھے سنتے ہی غصہ چڑھ آیا اور کھسیانے ہو کر فرمایا کہ ”اس وزیر کی گردن مار دو۔“ جلادوں نے، وونہیں اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ باہر لے جاویں، فرنگ کے پادشاہ کا ایلچی، دست بستہ روبرو آ کھڑا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ ”تیرا کیا مطلب ہے؟“ اس نے عرض کی ”امیدوار ہوں کہ تقصیر سے وزیر کی واقف ہوں“ میں نے فرمایا کہ ”جھوٹ بولنے سے اور بڑا گناہ کون سا ہے، خصوصاً پادشاہوں کے روبرو؟“ اُن نے کہا ”اس کا دروغ ثابت نہیں ہوا۔ شاید جو کچھ کہ عرض کی ہے، سچ ہو۔ ابھی بے گناہ کا قتل کرنا درست نہیں۔“ پادشاہ سلامت! اگلے شہریاروں نے بندی خانہ اسی سبب سے ایجاد کیا ہے کہ پادشاہ یا سردار، اگر کسو پر غضب ہوں تو اسے قید کریں۔ کئی دن میں غصہ جاتا رہے گا اور بے تقصیری اس کی ظاہر ہوگی۔ پادشاہ خون ناحق سے محفوظ رہیں گے۔ کل کو روز قیامت میں ماخوذ نہ ہوویں گے۔“ میں نے جتنا اس کے قائل کرنے کو چاہا، اس نے ایسی معقول گفتگو کی کہ مجھے لاجواب کیا۔ تب میں نے کہا کہ ”خیر تیرا کہنا پذیر ہُوا۔ میں خون سے اس کے درگزرا لیکن زندان میں مقیّد رہے گا۔ اگر ایک سال کے عرصے میں اس کا سخن راست ہوا کہ ایسے لعل کتے کے گلے میں ہیں تو اس کی نجات ہو

گی اور نہیں تو بڑے عذاب سے مارا جاوے گا۔'' فرمایا کہ ''وزیر کو پنڈت خانے میں لے جاؤ۔'' یہ حکم سن کر ایلچی نے زمین خدمت کی چومی اور تسلیمات کی۔

جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی، آہ واویلا مچا اور ماتم سرا ہو گیا۔ اس وزیر کی ایک بیٹی تھی برس چودہ پندرہ کی، نہایت خوب صورت اور قابل، نوشت وخواند میں درست۔ وزیر اس کو نپٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا، چنانچہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے ایک رنگ محل اس کی خاطر بنوا دیا تھا اور لڑکیاں عمدوں کی اس کی مصاحبت میں اور خواصیں شکیل خدمت میں رہتیں، ان سے ہنسی خوشی کھیلا کودا کرتی۔ اتفاقاً جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا، وہ لڑکی اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا، ایک بارگی اس کی ماں، روتی پیٹتی، سر کھلے، پاؤں ننگے، بیٹی کے گھر میں گئی اور دو ہتڑ اس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی ''کاش کہ! تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔'' وزیر زادی نے پوچھا۔ ''اندھا بیٹا تمھارے کس کام آتا؟ جو کچھ بیٹا کرتا میں بھی کر سکتی ہوں۔'' اماں نے جواب دیا ''خاک تیرے سر پر، یہ بپتا بیتی ہے کہ پادشاہ کے روبرو کچھ ایسی بات کہی کہ بندی خانے میں قید ہوا۔'' اُس نے پوچھا ''وہ کیا بات تھی؟ ذرا میں بھی تو سنوں'' تب وزیر کے قبیلے نے کہا کہ ''تیرے باپ نے شاید یہ کہا کہ ''نیشا پور میں کوئی سوداگر ہے، اس نے بارہ عدد لعل بے بہا کتے کے پٹے میں ٹانکے ہیں۔ پادشاہ کو باور نہ ہوا، اس نے جھوٹا سمجھا اور اسیر کیا۔

وزیر زادی بولی۔ ''اماں جان! تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ چاہیے، انسان بلائے ناگہانی میں صبر کرے اور امیدوار فضلِ الٰہی کا رہے۔ وہ کریم ہے، مشکل کسو کی اٹکی نہیں رکھتا اور رونا دھونا خوب نہیں۔ اس لڑکی نے عقل مندی سے ایسی ایسی طرح ماں کو سمجھایا کہ کچھ اس کو صبر و قرار آیا۔ تب اپنے محل میں گئی اور چپکی ہو رہی۔ جب رات ہوئی، وزیر زادی نے دادا کو بلایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑی بہت سی منت کی اور رونے لگی اور کہا۔ ''میں یہ ارادہ رکھتی ہوں کہ اماں جان کا طعنہ مجھ پر نہ رہے اور میرا باپ مخلصی پاوے۔ جو تو میرا رفیق ہو تو میں نیشا پور کو چلوں اور اس تاجر کو (جس کے کتے کے گلے میں ایسے لعل ہیں) دیکھ کر جو بن آوے لے کر آؤں، اور اپنے باپ کو چھڑاؤں۔''

(باغ و بہار)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- قبلہ گاہ سے کیا مراد ہے؟

ii- پادشاہ آزاد بخت کے غضب ناک ہونے پر فرنگ کے ایلچی نے کیا مشورہ دیا؟

iii- لعل کی تعریف سن کر وزیر دانا نے بادشاہ سے کیا کہا؟

iv- ماں کی بات سن کر وزیر زادی نے کیا جواب دیا؟

2- نصابی سبق ''سرگزشت آزاد بخت پادشاہ'' میں سے کوئی سے دس مشکل الفاظ، تراکیب اور محاورات منتخب کر کے معانی و مفاہیم بیان کیجیے۔

3- اصل عبارت کے مطابق خالی جگہ میں مناسب لفظ یا الفاظ لکھ کر جملوں کی تکمیل کریں:

i- فقیر کو جہاں شام ہوئی وہیں گھر ہے اور جو کچھ اس.......... میں دیکھا ہے، کہاں تک بیان کریں۔

ii- اتفاقاً ایک سال کوئی سوداگر.......... کے ملک سے آیا اور اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔

iii- میں اس لعل کو ہر روز جواہر خانے سے منگوا کر.......... دیکھا کرتا۔

iv- آپ پادشاہ ہیں اور پادشاہوں سے بہت بعید ہے کہ ایک.......... کی اتنی تعریف کریں۔

v- اگلے شہریاروں نے.......... اسی سبب ایجاد کیا ہے کہ پادشاہ یا سردار اگر کسی پر غضب ہوں تو اسے قید کریں۔

4- اس سبق میں قدیم املا کے الفاظ کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں جدید املا کے مطابق بنائیں۔

5- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

''جب یہ خبر وزیر کے گھر میں گئی، آہ واویلا مچا اور ماتم سرا ہو گیا۔ اس وزیر کی ایک بیٹی تھی برس چودہ پندرہ کی، نہایت خوب صورت اور قابل، نوشت و خواند میں درست۔ وزیر اس کو نپٹ پیار کرتا تھا اور عزیز رکھتا تھا، چنانچہ اپنے دیوان خانے کے پچھواڑے ایک رنگ محل اس کی خاطر بنوا دیا تھا، اور لڑکیاں عمدوں کی اس کی مصاحبت میں، اور خواصیں شکیل خدمت میں رہتیں، ان سے ہنسی خوشی کھیلا کودا کرتی۔ اتفاقاً جس دن وزیر کو محبوس خانے میں بھیجا، وہ لڑکی اپنی ہم جولیوں میں بیٹھی تھی اور خوشی سے گڑیا کا بیاہ رچایا تھا، ایک بارگی اس کی ماں، روتی پیٹتی، سر کھلے، پاؤں ننگے، بیٹی کے گھر میں گئی اور دوہتڑ اس لڑکی کے سر پر ماری اور کہنے لگی ''کاش کہ! تیرے بدلے خدا اندھا بیٹا دیتا تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور باپ کا رفیق ہوتا۔''

(۱۷۸۲ء - ۱۸۵۷ء)

رجب علی بیگ سُرور

رجب علی بیگ سرور دبستان لکھنو کے سب سے اہم نثر نگار ہیں۔ وہ ۱۷۸۲ء میں لکھنو میں پیدا ہوئے۔ سرور کی تعلیم و تربیت لکھنو ہی میں ہوئی۔ وہ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور اس زمانے کے خوش نویسوں میں شمار ہوتے ہیں، شاعری اور موسیقی سے بھی دل چسپی تھی۔ مشہور تصانیف میں فسانۂ عجائب، سرورِ سلطانی، شرر عشق، شگوفۂ محبت اور انشائے سرور شامل ہیں۔

سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانہ عجائب ہے۔ یہ کتاب ۱۸۲۴ء میں لکھی گئی۔ یہ حسن وعشق کا ایک عام قصہ ہے۔ اس میں طلسماتی فضا، مافوق الفطرت باتیں ہیں مگر واقعات دل چسپ ہیں۔ اس کتاب کی عبارت اس زمانے کے مروجہ فارسی اور انداز نگارش کی تقلید میں پُر تکلف اور مقفّٰی ہے۔ سرور کو الفاظ پر پوری قدرت حاصل ہے اور حسب موقع زبان استعمال کرنے پر قادر ہیں۔

حکایتِ پسرِ مجستن[1]

وہ بولا اسی شہر میں ایک شخص تھا۔ مجستن نام نہایت اہل دُوَل مرفہ حال صاحب علم وفضل ہر کمال طبیب اور ادیب بے بدل سخن سنج، لطیفہ گو برمحل۔ کمالات میں یگانہ روزگار تجارت میں نامور ہر دیار۔ سَو سَو جہاز ایک ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ نصیب ایسا جاگتا تھا کہ مٹی کو چھوتا، سونا ہاتھ میں آتا تھا۔ کسی طرح کا خواہش مند، بہ جز فرزندِ ارجمند نہ تھا۔ شب و روز اس کا خیال تھا، مدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش قسمتوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا۔ حسبِ دل خواہ، صورت میں غیرتِ ماہ۔ بہت شاداں ہو کے سرگرم پرورش ہوا۔ جب بارہ برس کا سن ہوا بسبب طبعِ رسا و تعلیم اُستادانِ باذکا جمیع علوم اور فنون سب میں یکتائے زمانہ مشہور ہوا۔ درس دینے لگا مطب کرنے لگا؛ چودھویں برس باپ سے سفر کی اجازت چاہی، کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔

مجستن نے کہا: اپنا بھی یہی قصد تھا؛ مگر چندے توقف کرو، اُس نے عرض کی حضور: عمرِ طبعی کو پہنچے، مُسن ہیں؛ فدوی کے سیاحت اور سفر کار گزار، کے یہی دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بہ قید حیات سفر کو جاؤں؛ گرم و سرد زمانہ دیکھوں، جودتِ طبع سب کو دکھاؤں آخر مجستن نے دس بارہ جہاز پر متاع و مال، اور کچھ رفیق قدیم دیانت دار، امانت شعار ہمراہ سب کو رخصت کیا۔ نشیب وفراز دوراں، نیرنگی جہاں سے آگاہ کر دیا کہ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے۔ دو مہینے کے بعد ہوائے جور گردوں سے سرنگوں ہو کے تباہ ہو گئے۔ مجستن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوب گیا۔ یارانِ ہمراہی عالمِ بقاء کو راہی ہوئے، یہ ایک تختے پر ڈوبتا تیرتا بہہ چلا۔ حیاتِ مستعار باقی تھی، ساتویں دن ہرتا پھرتا تختہ کنارے پر لگا کچھ طعمۂ ماہی ہوئے۔ غش سے جو افاقہ ہوا؛ آنکھیں کھولیں، سَر اٹھایا، تختے کو گھاٹ پر پایا۔ بہ ہر کیف اُترا کچھ گھانس لا، رسی بنا، وہ تختۂ کشتیِ شکستہ پتھر سے اٹکا دیا۔ پھر آپ بہ تلاش آب و دانہ روانہ ہوا۔ تھوڑی مسافت بہ صد آفت طے کی۔ شہرِ عظیم الشان، بہت آبادان نمودار ہوا۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجیب سخنہ طرفہ ماجرا نظر آیا۔ دوکان ہر

---

[1] فسانۂ عجائب میں شامل اس حکایت کا اصل عنوان "حکایتِ پسرِ مجستن بیٹے کا پیدا ہونا، سفر کی کیفیت، جہاز کی تباہی، شہزادی کا ملنا، پھر مفارقت، مجستن کا ساتھ جانا" ہے۔

ایک وا، اشرفی روپے کا ڈھیر جا بہ بجا اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتا مفقود۔ اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنس بشر سے خالی ہے۔ ویرانِ مطلق ہے، شہر کا وارث ہے نہ والی ہے۔ پھرتا پھرتا قلعے میں آیا باغ سرسبز، پُر میوہ، بیچ میں بنگلا زربفت کے نفیس پردے پڑے ہوئے ہیں۔ درِ دیوار پسِ جواہر بیش بہا قرینے سے جڑے ہوئے۔ پردہ اٹھا بنگلے میں گیا۔ پلنگ جواہر نگار گسترده، اس پر بمشکل مُردہ ایک شخص نے دوپٹا تانے نہ کوئی پائنتی نہ سرہانے پڑا ہے اس نے دوپٹا جو سرکایا۔ وہ عورت تھی ۔ نیند سے چونک پڑی ، سر اٹھایا۔ متعجب ہو کے اس کی صورت دیکھی، متاسّف ہو کے یہ سنایا اے عزیز! اپنی جوانی پر رحم کر۔ یہ مکان نہیں سیلِ فنا ہے، تو نا آشنا ہے۔ اس سے درگزر، وگرنہ آفت میں مبتلا ہوگا خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا۔ اس نے کہا ایسا ماجرا کیا ہے، بیان تو کر۔ عورت نے کہا! پہلے تُو اپنے آنے کا حال سنا کہ کیوں کر آ پھنسا۔

اِس نے کہا ہفتہ گزرا بے دانہ و آب، خستہ و خراب ہوں جو کچھ کھاؤں تو داستان پریشانی کی سناؤں۔

عورت بولی: مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے۔ سو کھانا یہاں کہاں بجز غم کھانے اور پانی سوا اشک بہانے کے، آنسو پینے کا نام ہے، اس سے نہیں پیتی ہوں اور کھانے کی قسم سے قسم تک نہیں کھاتی۔ متحیّر ہوں کیوں کر جیتی ہوں! مگر تنہائی میں خوف کھا کے روز دن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شب اولین گور ہے۔ جاں کنی رہتی ہے، سخت جانی کی بدولت نہیں مرتی ہوں۔

یہ غلط کہتے ہیں بے آب و خورش جیتے ہیں لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں

(جرأت)

تو اس باغ میں جا جس میوے پر رغبتِ خاطر ہو، کھا۔ مجستن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا، نہر سے پانی پیا گونہ رنج فاقہ کشی سے افاقہ ہوا۔ پھر عورت کے پاس بنگلے میں آ کے حسب و نسب اپنا اور باعثِ سفر، جہاز کی تباہی کی مفصل سرگزشت سنائی۔ پھر اس کا ماجرا پوچھا۔

وہ بولی اے شخص! اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں باپ میرا اس ملک کا حاکم تھا۔ چھوٹا بڑا یہاں کا شاد و خرم تھا۔ باپ جو تاج دار تھا مجھ کو مشغلہ سیر و شکار تھا۔ ایک روز لبِ دریا مصروف تماشا بیٹھی تھی، دفعتہً ایک سانپ پانی سے نکل کر میری طرف بڑھا۔ میں نے تیر مارا۔ معلوم نہیں لگا یا خطا کر گیا۔ پھر جو دیکھا تو اژدھائے مہیب بہ شکل عجیب جھپٹا آتا ہے۔ میں تو ڈر گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی۔ بو جو ہمراہ رکاب تھے، طعمۂ دہنِ مارِ خونخوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں، ساکنانِ شہر مع

بادشاہ، انسان سے حیوان، کوئی نہ بچا، سب ہلاک ہوئے، تہ خاک ہوئے؛ فقط میں سخت جان باقی ہوں۔ یہ صحبت ہے کہ قریبِ شام وہ مارِ خون آشام آ کر اس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے، دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ پر جب بھوک کا غلبہ ہوتا ہے، اسی باغ سے میوہ کھا پی لیتی ہوں، اس خرابی سے جیتی ہوں۔

کوئی غم خوار بہ جز ذات پروردگار نہ تھا، جس کو حالِ زار سناتی۔ اتنے دنوں میں آج تجھے دیکھا، خوفِ خدا آیا، مُطّلع کر دیا۔ پسرِ مجسٹن نے کہا: خاطرِ پریشان جمع رکھ: اگر فضلِ الٰہی مددگار ہے۔ آفت سے جلد نجات دیتا ہوں۔ یہ کہ کے جس جگہ سانپ کے بیٹھنے کی جگہ عورت نے بتائی تھی وہاں گڑھا کھودا اور قلعے سے باروت لا کر دور تک نقب سی بنائی۔ باروت اس میں چھڑک دی۔ پھر گھاس ہری اس پر جمائی۔ شہزادی نے کہا اب وہ آتا ہی ہوگا یہ جا کے سر نقب پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا، کہ دفعۃً وہ افعی پُر زہر، خدا کا قہر، آیا اور اپنی جگہ پر اس سبز قدم نے فرش زمردیں پایا بہت خوش ہو کر بیٹھا۔ یہ تو تاک میں تھا۔ پتھر سے آگ نکال، اس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا۔ وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہونچا[1] دونوں نے شکر سجدہ بدرگاہ دافع البلیات کیا۔ باہم بے اندیشہ وغم رہنے لگے۔ سات برس تک دونوں ساتھ رہے۔ اس عرصہ[2] میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے۔ ایک دن رنج تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔

کب تک تنہائی میں بسر کریں، شامِ غم انجام رو رو کے سحر کریں۔ کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ ویراں شہر آباد ہو، خاطر غمگین شاد ہو۔ وہ بولا: اگر وطن جاؤں اور مجسٹن کو یہاں لاؤں تو یہ بستی بسے۔ عورت نے کہا اکیلی میں کیونکر بسر کروں گی میں بھی ساتھ چلوں گی۔ آخرش، ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کر چل نکلے۔ قضارا، وہاں پہنچے تختہ بندھا تھا، ذہن میں آیا: پیادہ پا لڑکوں کا لے چلنا محال ہے، یہ بے جا خیال ہے تو حکمت علی اللہ کہ کے اسی تختہ پر سوار ہو رسی کھول دو، کہیں تو جا نکلو گے۔ یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے۔ وہ تختہ کھولنے لگا شہزادی بولی: مال واسباب تو اس قدر ہے کہ بیان میں زبان قاصر ہے، مگر ایک ناریل اکسیر سے بھرا ہے، دولت لا انتہا ہے رتی باون تولے کا تجربہ ہو چکا ہے۔ بہت تردد سے ظلِ سبحانی نے پایا تھا سب سے چھپایا تھا! جو تو اجازت دے تو اسے لے آؤں۔ مجسٹن کے بیٹے نے کہا اچھا۔ وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یوں ہی رہا۔ شہزادی لڑکا لے اتری۔ اس کے اترتے ہی ایسی تند ہوا چلی کہ کہ رسی، تکان سے ٹوٹ گئی، تختہ بہ چلا۔ ہر چند اس نے ہاتھ پاؤں مارے، وہ ساحل مطلب سے کنارے ہوا۔ کنارے پر شہزادی بہ حال خراب،

---

[1] پہنچا [2] عرصے میں

دریا میں وہ بادلِ کباب بہ نکلا۔ دل سے کہتا تھا: دیکھیے، مرضی ناخدائے کشتی بادبان شکستہ کیا ہے! یہ جھونکا ہوائے قومِ ثمود، عاد کا ہے۔ اس سوچ میں چلا جاتا تھا کہ ایک جہاز نمود ہوا۔ اہلِ جہاز نے جو دیکھا: تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لیے بہا جاتا ہے، رحم کا، پنسوہی کو دوڑا جہاز پر لیا۔ اتفاق زمانہ، مالک جہاز مجستن کا دوست و دَم ساز تھا۔ اس کو پہچانا بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ برس روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا جہاز کا حاکم مجستن کی ملاقات کو آیا۔ بچھڑے بیٹے کو باپ سے ملایا۔ یہاں جس دن سے جہاز کی تباہی مجستن نے سن پائی تھی، محیطِ رنج والم، غریقِ لجۂ غم تھا۔ بارے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بدرگاہ باری کیا۔ پوتا گھاتے میں ملا، اور کلمات شکر یہ اس سے کرنے لگا۔ اس نے کہا؛ بندہ پرور خیر ہے، دنیا اسی کا نام ہے۔ جس کا کام جس سے نکلے، وہ فخر و سعادت سمجھے بعد چند روز مجستن نے بیٹے سے روداد سفر پوچھی اس نے ابتدا سے انتہا تک حکایت، فلک کج رفتار کی شکایت بیان کی۔ وہ یہ سن کر سمجھا، مشکل پیچ پڑا، مگر سہل انگاری سے یہ جواب دیا اَلْخَیْرُ فِیْمَا وَقَعَ (یعنی) خیریت اسی میں تھی جو ہوا۔

(فسانۂ عجائب)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- مجستن کے ہاں جب بیٹے کی پیدائش ہوئی تو اسکی کیا عمر تھی؟

ii- مجستن کے بیٹے کے ساتھ کون سا حادثہ پیش آیا؟

iii- بیٹے نے باغ میں کیا دیکھا؟

iv- پسر مجستن نے سانپ کو مارنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

2- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیے:

توقّف، فدوی، جودت طبع، جورِ گردوں، مفقود، سیل فنا، متحیّر، طعمہ ذہنِ مارخونخوار، ساکنانِ شہر، نقیب، افعی، دافع بلیّات، اکسیر، پنسوہی، غریقِ لجۂ غم، حُمق

3- سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"یہ ایک تختے پر ڈوبتا تیرتا بہہ چلا۔ حیاتِ مستعار باقی تھی، ساتویں دن ہرتا پھرتا تختہ کنارے پر لگا کچھ طعمۂ ماھی ہوئے۔ غش سے جوافاقہ ہوا؛ آنکھیں کھولیں، سر اٹھایا، تختے کو گھاٹ پر پایا۔ بہ ہرکیف اُترا کچھ گھانس لا، رسی بنا، وہ تختۂ کشتیِ شکستہ پتھر سے اٹکا دیا۔ پھر آپ بہ تلاش آب ودانہ روانہ ہوا۔ تھوڑی مَسافت بہ صد آفت طے کی۔ شہرِ عظیم الشان، بہت آباد ان نمودار ہوا۔ آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجیب سانحہ طرفہ ماجرا نظر آیا۔ دوکان ہرایک وا، اشرفی روپے کا ڈھیر جابہ بجا اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتا مفقود۔ اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنس بشر سے خالی ہے۔ ویرانِ مطلق ہے، شہر کا وارث ہے نہ والی ہے۔ پھرتا پھرتا قلعے میں آیا باغ سرسبز، پُر میوہ، بیچ میں بنگلا زربفت کے نفیس پردے پڑے ہوئے ہیں۔ درِ دیوار پسِ جواہر بیش بہا قرینے سے جُڑے ہوئے۔ پردہ اٹھا بنگلے میں گیا۔"

4- متن میں مستعمل رموزِ اوقاف کی نشان دہی کرتے ہوئے مروجہ اعراب کے مطابق درست کر کے لکھیں۔

5- داستان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

ناول

ناول(NOVEL)اطالوی زبان کا لفظ ہے جوانگریزی کے وسیلے سے اردو میں رائج ہوااس کے معنی ہیں انوکھا، نرالا اور عجیب"۔ اصطلاح میں ناول وہ قصہ یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو اور ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے تجربات ومشاہدات کو تخیلاتی وتخلیقی خاص ترتیب سے پیش کردے۔ ناول میں حقیقت نگاری بنیادی شرط ہے۔ ناول میں مندرجہ ذیل عناصر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ کہانی، پلاٹ، کردار، اندازنظر، زبان وبیان، منظرنگاری اور تجسس وغیرہ۔ ناول کی چند اہم اقسام یہ ہیں: کرداری ناول، ڈرامائی ناول، مہماتی ناول، نظریاتی ناول، تاریخی، جاسوسی، اصلاحی ناول۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد سب سے پہلے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔ ان کا ناول مراۃ العروس اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں پر مقصدیت کا غلبہ ہے۔ توبۃ النصوح، ابن الوقت، مراۃ العروس اُن کے مشہور ناول ہیں۔ ہادی رسوا کا امراؤ جان ادا اُردو ناول کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ دورِ جدید میں لکھے جانے والے چند اہم اور معروف ناول یہ ہیں۔ "خدا کی بستی"، شوکت صدیقی "آگ کا دریا" قراۃ العین حیدر، "سنگم" احسن فاروقی، "آنگن" خدیجہ مستور "اداس نسلیں"، عبداللہ حسین، "خون جگر ہونے تک"، ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی"، انتظار حسین کا "بستی" اور بانو قدسیہ کا "راجہ گدھ"

(۱۸۳۶ء۔۱۹۱۲ء)

مولانا نذیر احمد دہلوی

نذیر احمد ضلع بجنور کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ بعد دہلی کالج میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ مولوی نذیر احمد نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک مدرس کی حیثیت سے کیا لیکن خداداد ذہانت اور انتھک کوششوں سے جلد ہی ترقی کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب نے انگریزی میں خاصی استعداد پیدا کر لی اور انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ "تعزیراتِ ہند" کے نام سے کیا جو سرکاری حلقوں میں بہت مقبول ہوا اور آج تک استعمال ہوتا ہے۔ آپ کی مشہور تصانیف میں مراۃ العروس، توبۃ النصوح، بنات النعش، ابن الوقت، رویائے صادقہ، فسانۂ مبتلا شامل ہیں۔ آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔

نذیر احمد پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے مافوق الفطرت باتوں کی بجائے روزمرہ زندگی کے واقعات کو پیش کیا۔ ان کے تمام ناول کسی نہ کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔

ماما عظمت

اصغری ایک ہنر منداور باسلیقہ لڑکی تھی۔اس کی شادی محمد کامل سے ہوئی۔وہ سسرال میں آئی تو وہاں بھی طبیعت کے اعتدال اور سلیقہ شعاری سے سب کو متاثر کیا۔اس نے اپنی نند محمودہ سے ربط بڑھایا اور اس کے ذریعے گھر کے معاملات سے باخبر رہنے لگی۔چند دنوں میں باورچی خانے تک جانے لگی اور ماما عظمت کو بھوننے بگھارنے میں صلاح دینے لگی۔جلد ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ ماما عظمت اس کے گھر کے ہر کام میں دخیل ہے اور سخت بددیانت ہے۔

اس ماما عظمت کی حقیقت اس طرح پر ہے کہ یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی اور ہمیشہ لوٹنے پر اتارو۔ایک دن کی بات ہو تو چھپ چھپا جائے۔آئے دن اس پر شبہہ ہوتا رہتا تھا مگر تھی چالاک۔گرفت میں نہیں آتی تھی۔کئی مرتبہ نکالی گئی، جب موقوف ہوئی بنیے، بزاز، سنار، قصائی، کنجڑے جن سے ان کی معرفت ادھار قرض اٹھتی تھی، تقاضے کو آموجود ہوئے۔اس ڈر کے مارے پھر بلائی جاتی تھی۔یوں چوری اور سرزوری ماما عظمت کی تقدیر میں لکھی تھی۔جتا کر لیتی اور بتا کر چراتی، دکھا کر نکالتی اور لکھا کر مکر جاتی۔گھر میں آمدنی کم اور عادتیں بگڑی ہوئیں۔کھانے میں امتیاز، کپڑے میں تکلّف، سب کارخانہ قرض پر تھا اور قرض کی آڑھت ماما عظمت کے دم سے تھی۔کھلے خزانے کہتی تھی کہ میرا نکلنا آسان بات نہیں، گھر نیلام کرا کے نکلوں گی۔اینٹ سے اینٹ بجا کر جاؤں گی۔اصغری نے جو حساب کتاب میں روک ٹوک شروع کی تو ماما عظمت اصغری کی جانی دشمن ہو گئی اور اپنے بچاؤ کے لیے بدلہ لینے کی نظر سے تدبیریں سوچنے لگی اور اس فکر میں ہوئی کہ محمد کامل اور اس کی ماں سے اصغری کو برا بنائے۔اصغری نے جب دیکھا کہ ماما گھر کی مختارِ کل ہے تو اپنے جی میں کہا — ”پھر ناحق کی جھک جھک سے کیا فائدہ؟“ باورچی خانے کا جانا اور کھانے میں دخل دینا بالکل موقوف کیا۔گھر والوں کو اصغری کے ہاتھ کی چاٹ لگ گئی تھی۔پہلے ہی وقت سے منہ بنانے لگے۔

ایک دن برسات کے موسم میں بادل گھرا ہوتا تھا۔ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔محمد کامل نے کہا: ”آج تو کڑاہی کو دل چاہتا ہے لیکن بشرطیکہ تمیزدار بہو اہتمام کریں۔“ اصغری کوٹھے پر رہا کرتی تھی، اس کو خبر نہیں کہ محمد کامل نے کڑاہی کی فرمائش کی۔ماما عظمت گھی، شکر، بیسن وغیرہ لے آئی اور محمد کامل سے کہا: ”صاحبزادے لیجیے سب سودا تو میں لے

آئی۔ جاؤں بہو صاحب کو بلا لاؤں۔"

کوٹھے پر گئی تو اصغری سے کڑاہی کا کچھ تذکرہ تک نہیں آیا۔ اسی طرح الٹے پاؤں اتر آئی اور کہا: "بہو کہتی ہیں میرے سر میں درد ہے۔" ماما عظمت سے معمولی کھانا تو پک نہیں سکتا تھا کڑاہی کیا خاک تلتی۔ سب چیزوں کا ستیاناس ملا کر رکھ دیا۔ کس چاؤ سے تو محمد کامل نے فرمائش کی تھی، بدمزہ پکوان کھا کر بہت اُداس ہوا۔ کوٹھے پر گیا تو بی بی کو دیکھا بیٹھی ہوئی اپنا پائجامہ سی رہی ہیں۔ جی ہی جی میں ناخوش ہوا کہ ایں! سینے کو سر میں درد نہیں اور ذرا کڑاہی کو کہا تو درد سر کا بہانہ کر دیا۔ یہ پہلی ناخوشی محمد کامل کو اصغری سے پیدا ہوئی اور دستور ہے کہ میاں بیبیوں میں بگاڑ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر محمد کامل بی بی سے بطور شکایت پوچھتا کہ کیوں صاحب ذرا سا کام نہ ہو سکا تم سے، اور درد سر کا بہانہ کر دیا، اسی وقت دو چار باتوں میں معاملہ طے ہو جاتا اور ماما عظمت کی فطرت کھل پڑتی لیکن محمد کامل نے منہ پر تو لگائی مہر اور دل میں دفتر شکایت لکھ چلا۔ اصغری کو محمد کامل کی کم التفاتی سے کھٹکا ہوا اور سمجھی کہ خدا خیر کرے۔ لڑائی کا آغاز نظر آتا ہے، ساس کو دیکھا تو ان کو بھی کسی قدر مکدّر پایا۔ حیرت میں تھی کہ الٰہی کیا ماجرا ہے؟

ابھی یہ بات طے نہیں ہوئی تھی کہ ماما عظمت نے ایک شرارت اور کی۔ رمضان کا قرب تھا۔ محمد کامل کی ماں نے ماما عظمت سے کہا: "ماما! رمضان آتا ہے۔ ابھی سے سب تیاری کر چلو۔ برتن چھوٹے بڑے سب قلعی کروانے ہیں۔ مکان میں برس بھر ہوا سفیدی نہیں ہوئی۔ لالہ ہزاری مل سے کہو کہ جس طرح ہو سکے کہیں سے پچاس روپے دے۔ عید کا خرچ سر پر چلا آتا ہے۔"

ماما عظمت بولی: "تمیزدار بہو اپنی ماں کے یہاں مہمان جائیں گی۔ بہو جائیں گی تو چھوٹے صاحبزادے بھی جائیں گے۔ پھر بیوی تمہارا اکیلا دم ہے۔ مکان میں قلعی ہو کر کیا ہو گی اور برتن قلعی ہو کر کیا ہوں گے۔ ہزاری مل کم بخت تو ایسا بے مروت ہو گیا ہے کہ ہر روز تقاضے کو اس کا آدمی دروازے پر کھڑا رہتا ہے اور قرض کیوں کر دے گا۔"

محمد کامل کی ماں نے ماما سے پوچھا: "سچ بتا۔ تمیزدار بہو ضرور جائیں گی؟" ماما بولی: "بیوی جانے نہ جانے کی تو خدا جانے، جو سنا تھا سو کہہ دیا۔"

ماما عظمت کی شامت سر پر سوار تھی۔ تیسرا وار اصغری پر اور صحیح کیا۔

ہزاری مل کی تو عادت تھی جب کبھی ماما عظمت کو اپنی دکان کے سامنے سے آتے جاتے دیکھتا تو ادبدا کر چھیڑتا کہ کیوں ماما ہمارے حساب کتاب کا بھی کچھ فکر ہے؟ اور ساتویں آٹھویں دن گھر پر

تقاضا کہلا بھیجتا۔ ایک دن حسب معمول ماما عظمت سودے سُلف کو باہر جاتی تھی۔ ہزاری مل نے ٹوکا۔ ماما بولی: ''اے لالہ! یہ کیا تم نے مجھ سے آئے دن کی چھیڑ خانی مقرر کی ہے، جب مجھ کو دیکھتے ہو تقاضا کرتے ہو جن کو دیتے ہو ان سے مانگو، ان سے تقاضا کرو۔''

ہزاری مل نے کہا: ''یہ بات تم نے کیا کہی کہ مجھ سے واسطہ نہیں۔ دکان سے تو تم ہی لے جاتی ہو، ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔ ہم تو تم کو جانتے ہیں اور تمھاری ساکھ پر دیتے ہیں۔ ہم گھر والوں کو کیا جانیں؟ بیوہار تو مالک کے ہاتھ ہے۔ پر تمھارے ہاتھوں سے ہوتا ہے یا نہیں۔ نہ ہمارے نام رقعہ نہ چٹھی۔ تم نے مالک کے نام پر جو مانگا سودیا۔''

ماما: ''ہاں یوں کہو، اس سے میں کب مکرتی ہوں، جو لے گئی ہوں ہزاروں میں کہ دوں، لاکھوں میں کہ دوں اور ہماری بیوی بھی بے چاری کبھی تکرار نہیں کرتیں۔''

ہزاری مل: ''ماما! بیگم صاحب تو حقیقت میں بڑی امیر ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔ پھر ہزاری مل نے آہستہ سے پوچھا۔ چھوٹی بہو صاحب کا کیا حال ہے؟ کیسی ہیں؟''

ماما: ''لالہ! کچھ نہ پوچھو، بیٹی تو امیر گھر کی ہیں پر دل کی بہت تنگ ہیں۔''

بہت سی باتوں کے بعد ماما عظمت ہزاری مل سے رخصت ہو کر سودا سلف لے کر گھر میں آئی تو محمد کامل کی ماں نے پوچھا: ''ماما! تو بازار جاتی ہے تو ایسی بے فکر ہو جاتی ہے کہ کھانا پکانے کا کچھ خیال تجھ کو نہیں رہتا۔ دیکھ تو کتنا دن چڑھا ہے۔ اب کس وقت گوشت چڑھے گا۔ کب پکے گا؟ کھانا کب ملے گا؟''

ماما: موئے ہزاری مل کے جھگڑے میں اتنی دیر ہو گئی۔ وہ جانہار ہر روز مجھ کو آتے جاتے ٹوکا کرتا ہے۔ آج میری جان جل گئی اور میں نے کہا: کیا تو نے مجھ سے روز کی چھیڑ خانی مقرر کی ہے۔ کیوں مرا جاتا ہے؟ ذرا صبر کر۔ خرچ آنے دے تو تیرا اگلا پچھلا حساب کتاب بیباق ہو جائے گا۔ وہ موا تو میرے سر ہو گیا اور بھرے بازار میں لگا مجھ کو فضیحت کرنے۔''

محمد کامل کی ماں: ''ہزاری مل کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ تو ایسا نہ تھا۔ آخر برسوں سے ہمارا اس کا لین دین ہے۔ سویرے بھی دیا ہے۔ دیر کر کے بھی دیا ہے۔ کبھی اس نے تکرار نہیں کی۔''

ماما: ''بیوی کوئی اور مہاجن دکان میں ساجھی ہوا ہے۔ اس موئے نے جلدی مچا رکھی ہے۔ جس جس پر لینا تھا سب سے کھڑے کھڑے وصول کر لیا۔ جس نے نہیں دیا نالش کر دی۔''

اس خبر کے سنتے ہی محمد کامل کی ماں کو سخت تردُّد پیدا ہوا۔ اس نے ماما عظمت سے کہا: ''اگر

سچ مچ ہزاری مل نے نالش کردی تو کیا ہوگا؟ میرے پاس تو اتنا اثاثہ بھی نہیں کہ بیچ کر ادا کردوں گی۔"

ماما: "بیوی نالش تو ہوئی دھری ہے۔ مہینے بھر کے واسطے تمیز دار بہو اپنے کڑے دے دیتیں تو بات رہ جاتی۔ بالفعل ان کڑوں کو گروی رکھ آدھے تہائی ہزاری مل کے بھگت جاتے۔ مہینے بھر میں یا تو میاں خرچ بھیج دیتے یا میں کسی اور مہاجن سے لے آتی۔

محمد کامل کی ماں: "اری تو کوئی دیوانی ہوئی ہے۔ خبردار ایسی بات منہ سے بھی مت نکالنا۔ اگر رہنے کا مکان تک بھی بک جائے تو بلا سے مجھ کو منظور ہے لیکن بہو سے کہنے کا منہ نہیں۔ ڈولی لے آؤ۔ میں بہن تک جاؤں۔ پھر جیسی صلاح ٹھہرے گی۔ دیکھا جائے گا۔"

محمد کامل کی ماں تو سوار ہو بہن کے ہاں خانم کے بازار سدھاریں اور محمودہ نے سب حال تمیز دار بہو کو جا سنایا۔ وہاں محمد کامل کی ماں کو ان کی بہن نے ٹھہرا لیا۔

ماما عظمت نے بیٹھے بٹھائے ایک بدذوقی اور کی۔ ان دنوں لاٹ صاحب کی آمد آمد تھی۔ شہر کی صفائی کے واسطے حاکم کی طرف سے بہت تاکید ہوئی۔ ہر محلے اور ہر کوچے میں اشتہار لگائے گئے کہ سب لوگ اپنے اپنے کوچے اور گلیاں صاف کریں۔ دروازوں پر سفیدی کرالیں، بدرویں صاف رکھیں۔ اگر کسی جگہ کوڑا پڑا ملے گا تو جرمانہ کیا جائے گا۔ اسی مضمون کا ایک اشتہار اس محلے کے پھاٹک پر بھی لگایا گیا۔ ماما عظمت جا کر محلے کے پھاٹک سے وہ اشتہار اکھاڑ لائی اور چپکے سے اپنے دروازے پر لگا دیا۔ پھر اندھیرے منہ خانم کے بازار میں محمد کامل کی ماں سے خبر کرنے دوڑی گئی۔ ابھی مکان کے کواڑ بھی نہیں کھلے تھے کہ اس نے جا آواز دی۔ محمد کامل کی ماں نے آواز پہچانی اور کہا:

"ارے دوڑو! کواڑ کھولو۔ عظمت ناوقت کیوں بھاگی آئی ہے؟"

عظمت سامنے آئی تو پوچھا: "ماما خیریت ہے؟"

عظمت بولی۔ "بیوی مکان پر اشتہار وشتار کیا ہوتا ہے (اے ہے مجھ رنڈیا کو تو سیدھا نام بھی نہیں آتا) لگا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاری مل نے نالش کردی۔"

محمد کامل کی ماں نے اپنی بہن سے کہا۔ "لو بوا! میں تو جاتی ہوں۔ جاؤں ہزاری مل کو بلوا کر سمجھاؤں گی۔ خدا اس کے دل میں رحم ڈالے۔"

بہن بولی۔ "آپا میں شرمندہ ہوں کہ مجھ سے روپے کا بندوبست نہ ہو سکا لیکن میرے گلے کا توڑا موجود ہے۔ اس کو لیتی جاؤ گروی رکھنے سے کام نکلے تو خیر ورنہ بیچ ڈالنا۔"

محمد کامل کی ماں نے کہا ''خیر میں توڑا لیے جاتی ہوں۔ مگر اس کا روپیا بہت چڑھ گیا ہے۔ ایک توڑے سے کیا ہوگا؟۔

بہن بولی۔ '' آخر انھوں نے بھی تو کہا ہے کہ میں کسی دوسرے مہاجن سے قرض لا دوں گا۔تم بسم اللہ کر کے سوار ہو۔ وہ آتے ہیں تو میں ان کو بھی پیچھے سے بھیجتی ہوں۔''

غرض محمد کامل کی ماں مکان پر پہنچی۔ دروازے پر اتری۔ اشتہار لگا دیکھا افسوس کی حالت میں چپ آ کر بیٹھ گئیں۔ ساس کی آمد سن کر اصغری کوٹھے پر سے اتری۔ سلام کیا۔ ساس کو مغموم دیکھ کر پوچھا۔ '' آج اماں جان آپ کا چہرہ بہت اداس ہے۔''

ساس: ''مہاجن نے نالش کر دی ہے۔ روپے کی صورت کہیں سے نہیں بن پڑتی۔ مکان پر اشتہار لگ چکا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟''

اصغری: '' آپ اس کا ہرگز فکر نہ کیجیے۔ اگر ہزاری مل نے نالش کر دی ہے تو کچھ حرج نہیں۔ اس کے روپے کی کچھ سبیل ہو جائے گی۔ آپ اتنا فکر کیوں کرتی ہیں؟ ہزاری مل کو جو اپنی طرف سے کرنا تھا کر چکا۔''

ساس: '' کامل ہوتا تو میں اس کو ہزاری مل کے پاس بھیجتی۔''

اصغری: ''یوں آپ کو اختیار ہے لیکن میرے نزدیک مہاجن سے ڈرنا کسی طرح مناسب نہیں، ورنہ اس کو آئندہ کے واسطے دلیری ہو جائے گی اور آئے دن نالش کا ڈراوا دکھایا کرے گا۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ ادھر کا اشارہ نہ ہو اور باہر سے کوئی دباؤ اس پر پڑ جائے کہ وہ نالش کی پیروی سے باز رہے۔''

یہ بات سن کر محمد کامل کی ماں کو کسی قدر تسلی ہوئی۔ لیکن اصغری حیرت میں تھی کہ یہ کیا بات ہے اور اشتہار کا معاملہ بھی عجب ہے۔ میں گھر میں بیٹھی رہی۔ مجھ کو خبر نہیں۔ حاکم کا اشتہار ہوتا تو کوئی چپڑاسی پیادہ پکارتا۔ آواز دیتا۔

محمودہ سے اصغری نے کہا ''جاؤ دروازے پر جو کاغذ لگا ہوا ہے اس کو چپکے سے اکھاڑ لاؤ۔ محمودہ کاغذ اکھاڑ لائی۔ اصغری نے پڑھا۔ تو صفائی کا حکم تھا نالش کا کچھ مذکور نہ تھا۔ سمجھ گئی کہ یہ بھی اس عظمت کی چالاکی ہے، ساس پر تو حال ظاہر نہیں کیا۔ لیکن ان کا اچھی طرح اطمینان کر دیا کہ آپ دل جمعی سے بیٹھی رہیے۔ نالش کا ہرگز کھٹکا نہیں۔

شب برات کے بعد اصغری کے باپ کی آمد کی بات شروع ہوئی اور نو دس دن بات کی بات

میں گزر گئے۔ رمضان سے چار دن پہلے دور اندیش خان[1] صاحب دہلی میں داخل ہوئے۔ اصغری نے پہلے سے اپنے باپ کی سن رکھی تھی اور ساس اور میاں سے ٹھیر گیا تھا کہ جس دن تحصیلدار صاحب آئیں گے اسی دن میں ان سے ملنے جاؤں گی۔ جب اصغری کو باپ کے آنے کی خبر معلوم ہوئی فوراً ڈولی منگا جا پہنچیں۔ باپ نے گلے سے لگا لیا اور آب دیدہ ہوئے۔ دیر تک حال پوچھتے بتاتے رہے۔ غرض اس رات بھر اور اگلے دن بھر اصغری ماں کے یہاں رہی اور شام کے قریب باپ سے کہا کہ "اگر اجازت دیجیے تو آج میں چلی جاؤں۔"

باپ نے کہا۔ "اجی ایک ہفتہ تو رہو۔ ہم سمدھن کو کہلا بھیجیں گے۔"

اصغری نے کہا "جیسا آپ ارشاد فرمائیں تعمیل کروں۔ لیکن ابا جان[2] کے آنے سے پہلے گھر میں میرا موجود رہنا مصلحت معلوم ہوتا ہے۔"

باپ نے سوچ کر کہا "ہاں بات تو ٹھیک ہے۔"

غرض اصغری باپ سے رخصت ہوئی۔ مغرب سے پہلے گھر آموجود ہوئی اگلے دن کھانے کے وقت مولوی محمد فاضل صاحب محمد کامل کے باپ بھی آپہنچے۔ چونکہ اصغری بیاہ کے بعد سسر کے سامنے نہیں ہوئی تھی۔ سسر کو آتا دیکھ کر کوٹھے پر جا بیٹھی۔

ساس کوٹھے پر گئیں اور کہا "بیٹی چلو شرم کی کیا بات ہے۔ تم تو ان کی گودوں میں کھیلی ہو۔"

ساس کے کہنے سے اصغری اٹھ کر ساتھ ہولی اور سسر کو جھک کر سلام کیا اور ادب سے علیحدہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے کہا۔ "خدا تمھاری عمر اور نیک بختی میں برکت دے۔ اور حقیقت میں ہمارے گھر کے اچھے نصیب ہیں جو تم ہمارے گھر میں آئیں اور مجھے یقین ہوا کہ اس گھر کے کچھ دن پھرے اور ان شاء اللہ تمھاری مرضی اور تمھاری رائے کے موافق سب انتظام کیا جائے گا۔"

غرض دو چار دن تو مولوی صاحب ملنے ملانے میں رہے پھر اول کے دو چار روزے کے سبب گھر کے کسی کام کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ ایک بہو کو بلا کر پاس بٹھایا اور ماما عظمت سے کہا۔ "ماما ہمارے رہتے سب حساب کتاب کر لو جس جس کا لینا دینا ہے سب لکھا دو تا کہ جس کو جتنا مناسب ہو دیا جائے اور جو باقی رہ جائے اس کی قسط بندی کر دی جائے۔"

ماما نے کہا "ایک کا حساب ہو تو زبانی بھی یاد رکھا جائے بنیا، بزاز، قصائی، کنجڑا، حلوائی سب

---

1. اصغری کے باپ کا نام

2. مراد ہے اصغری کے خسر محمد فاضل سے۔ انھیں بھی اصغری نے بلا بھیجا تھا۔

ہی کا دینا ہے، ہزاری مل کا بڑا بھاری حساب الگ ہے۔ جس کو جتنا دینا ہو مجھ کو دیجیے۔ لے جا کر آپ کے نام جمع کرادوں۔"

مولوی صاحب تو سیدھے سادھے آدمی تھے دینے کو آمادہ ہوگئے، اصغری نے کہا یوں علی الحساب دینے سے کیا فائدہ۔ پہلے ہر ایک کا قرضہ معلوم ہو۔ تب اس کو سوچ سمجھ کر دینا چاہیے۔"

ماما نے کہا "کھانے سے فراغت پاؤں تو جا کر ہر ایک سے پوچھ آؤں گی۔"

اصغری: "پوچھ آنے سے کیا ہوگا؟ جس کو لینا ہو یہاں آ کر حساب کر جائے۔"

ماما: "بیوی آپ نے ایک بات کہ دی۔ اب میں کہاں کہاں بلاتی پھروں۔ اور وہ لوگ اپنے دھندے سے کب چھٹی پاتے ہیں جو میرے ساتھ چلے آئیں گے؟"

اصغری: "ماما کوئی روز روز کا بلانا نہیں ہے۔ ایک دن کی بات ہے جا کر بلالاؤ۔ شام کے کھانے کا کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ تم آج کام کرو اور لینے والے تو دینے کا نام سن کر دوڑیں گے۔ ہزاری مل نالش کرنے کو دو دو کوس پر کچہری تو گیا، یہاں آتے کیا اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے؟ اور دور کون ہے۔ کنجڑا، قصائی، بنیا، حلوائی سب اسی گلی میں ہیں۔ صرف بزاز اور ہزاری مل دور ہیں ان کو کل پر رکھو یہ پھٹکل حساب آج طے ہو جائے۔"

ماما عظمت کی کسی طرح مرضی نہ تھی کہ حساب ہو۔ لیکن اصغری نے باتوں میں ایسا دبایا کہ کچھ جواب نہ بن پڑا۔ سب سے پہلے حلوائی آیا پوچھا "لالہ! تمھارا کیا پانا ہے؟" حلوائی۔ "تیس روپے۔"

پوچھا گیا۔ "کیا کیا چیز تمھارے یہاں سے آئی ہے؟ تیس روپے تو بہت زیادہ بتاتے ہو۔"

حلوائی: "صاحب تیس روپے بھی کچھ بہت ہوتے ہیں۔ ایک رقم دس سیر شکر تو اسی شب برات کو آئی۔"

محمد کامل کی ماں: "ارے کیسی شکر؟ اب کے مرتبہ تو ہمارے گھر جو کچھ پکا پایا بازار سے نقد آیا۔"

یہ سن کر ماما عظمت کا رنگ فق ہوگیا اور حلوائی سے بولی۔ وہ دس سیر شکر تو نے ان کے حساب میں کیوں لکھ لی؟ وہ تو میں دوسرے کے واسطے لے گئی تھی۔ اور تجھ کو بتا بھی دیا تھا۔"

حلوائی: مجھ سے تم نے کسی گھر کا نام نہیں لیا۔ اسی سرکار کے نام سے لائی ہو۔ ورنہ مجھے کیا فائدہ تھا کہ دوسرے کی چیز ان کے نام لکھتا اور مجھ سے تو اور کسی سرکار سے اچاپت بھی نہیں۔"

غرض ماما کھسیانی باتیں کرنے لگی۔ مولوی صاحب نے کہا ”بھلا شکر کی رقم تو رہنے دو۔ اور چیزیں بتاؤ۔“

غرض اسی طرح بہت سی چیزیں اس نے بتائیں جو عمر بھر گھر میں نہیں آئی تھیں۔ چار سیر بالوشاہی مولود شریف کے واسطے اور مزہ یہ کہ یہاں کبھی کسی نے مولود کی مجلس نہیں کی۔ صرف چھے سات روپے تو سچ نکلے باقی سب جھوٹ۔ مولوی صاحب کا جی جل گیا اور بے طرح ان کو غصہ آیا اور پوچھا۔ ”کیوں ری نمک حرام عظمت، ایسا ہی دنیا بھر کا قرض تو نے اس گھر پر کر رکھا ہے اور یوں تو نے گھر کو خاک میں ملایا ہے۔“

حلوائی ہو چکا تو کنجڑا آیا۔ اس نے کہا ”میاں میرا تو حساب معمولی ہے دو آنے روز کی ترکاری۔“

محمد کامل کی ماں: ”ارے سیر بھر ترکاری میرے گھر میں آتی ہے۔ دو آنہ روز کی ہوئی؟“

کنجڑا: ”حضرت میری دکان سے ماما تین سیر لاتی ہے۔“

ماما: ”ہاں تین سیر لاتی ہوں۔ سیر بھر تمھارے نام سے۔ سیر بھر اپنی بیٹی کے واسطے اور سیر بھر دوسرے گھر کے واسطے۔ میں کیا مکرتی ہوں؟ یہ موا سب تمھارے نام بتاتا ہے۔“

کنجڑا: ”اری بڑھیا بے ایمان! ہمیشہ سے تو اسی گھر کے حساب میں تین سیر لاتی رہی اور جب روپیا ملا اسی گھر سے ملا۔“

قصائی اور بنیے کا حساب ہوا تو اس میں بھی ہزاروں فریب نکلے اور ثابت ہوا کہ ماما اسی گھر کے سودے میں اپنی بیٹی خیراتن اور اپنی دو تین ہمسایوں کے گھر پورے کرتی تھی۔ اس گھر کے نام سے سودا لاتی اور دوسری جگہ بیچ ڈالتی۔ غرض شام تک پھٹکل حساب ہوا اور اب بزاز اور ہزاری مل باقی رہے۔ مولوی صاحب نے کہا۔ ”اب ناوقت ہو گیا ہے۔ آج ملتوی کرو کل دیکھا جائے گا۔ “لیکن مولوی صاحب نے آہستہ سے یہ بھی کہا کہ ”ایسا نہ ہو عظمت بھاگ جائے۔“

اصغری: ”گھر بار چھوڑ کر بچے مکان چھوڑ کر کہاں بھاگ جائے گی ہاں شاید غیرت مند ہو تو کچھ کھا پی لے مگر ایسی غیرت مند ہوتی تو ایسا کام کیوں کرتی تاہم حفاظت ضرور ہے لیکن فقط اس قدر کہ باہر آتی جاتی کو کوئی دیکھتا رہے۔“

مولوی صاحب کے خدمت گار جو ساتھ آئے تھے ایک کو چپکے سے کہہ دیا کہ ماما کو آتے جاتے دیکھتے رہو۔ جب کھانے سے فارغ ہوئی۔ ماما چپکے سے اٹھ باہر چلی۔ خدمت گار دبے پاؤں

پیچھے پیچھے ساتھ ہوا۔ ماما پہلے تو اپنے گھر گئی اور وہاں سے کچھ بغل میں مار تیر کی طرح سیدھی بزاز کے مکان پر جا کر اس کو آواز دی۔ بزاز گھبرا کر باہر نکلا کہ ''بڑی بی تم اس وقت کہاں؟''

عظمت: ''مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ جس جس کا دینا ہے سب کا حساب ہوتا ہے۔ کل تم بھی بلائے جاؤ گے تو ایسی بات مت کرنا جس میں میری فضیحت ہو۔''

بزاز: ''حساب میں تمھاری فضیحت کی کیا بات ہے۔''

ماما: ''لالہ تم تو جانتے ہو یہ کمبخت لالچ بہت برا ہوتا ہے۔ سرکار کے حساب میں اپنے واسطے بھی تمھاری دکان سے کبھی کبھی لٹھا، نین سکھ اور دریس لے گئی ہوں۔''

بزاز: ''کیا معلوم تم اپنے واسطے کیا لے گئی ہو؟''

ماما: ''مجھ کو اس وقت حساب کرنے کا تو ہوش نہیں لیکن دو چار تھان دریس، لٹھے اور نین سکھ کے اور دس گز اودا قند میرے حساب میں نکلے گا تو میرے ہاتھ کی چار چوڑیاں سولہ روپے کی ہیں۔ گھس گھسا کر ایک روپیہ کم ہو گیا ہوگا۔ پندرہ روپے میرے نام سے کم کر دینا اور دو چار روپے اور جو میرے نام نکلیں گے میں دینے کو موجود ہوں۔''

بزاز: ''چوڑیاں تم دیتی ہو۔ خیر میں لے لیتا ہوں۔ لیکن رات کا وقت ہے۔''

عظمت: ''اس وقت میری عزت تمھارے ہاتھ میں ہے جس طرح ہو سکے بچاؤ۔''

بزاز سے رخصت ہو سیدھی ہزاری مل کے گھر پہنچی وہ بھی حیران ہوا اور بولا کہ اس وقت تم کہاں؟ اس کے پاؤں پڑ کر رو کر کہنے لگی کہ ''مجھ سے ایک خطا ہو گئی ہے۔''

ہزاری مل: ''وہ کیا؟''

عظمت: ''تم وعدہ کرو کہ معاف کر دو گے تو میں کہوں۔''

ہزاری مل: ''بات تو کہو۔''

ماما عظمت: ''چار مہینے ہوئے لاہور سے خرچ آیا تھا اور مولوی صاحب نے سو روپے تم کو بھیجے تھے وہ میرے پاس خرچ ہو گئے اور سرکار میں ڈر کے مارے میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اب مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں تم کو حساب کے واسطے طلب کریں گے۔ میں اس روپے کا ٹھکانا لگا دوں گی تم اس کو ظاہر مت کرنا۔

ہزاری مل: ''دو چار روپے کی بات ہوتی تو میں چھپا بھی لیتا۔ اکٹھے سو روپے تو میرے کیے چھپ نہیں سکتے۔''

ماما: ''کیا سو روپے کا بھی میرا اعتبار نہیں۔''

ہزاری مل: ''صاف بات تو یہ ہے کہ تمھارا ایک کوڑی کو بھی اعتبار نہیں جس گھر سے تم نے عمر بھر پرورش پائی اُن ہی کے ساتھ تم نے یہ سلوک کیا تو دوسرے کے ساتھ کب چوکنے والی ہو۔''

عظمت: ''ہاں لالہ جب برا وقت سر پر آتا ہے تو اپنے دشمن ہو جاتے ہیں۔ خیر اگر تم کو اعتبار نہیں تو لو یہ میری بیٹی کی پہنچیاں اور جوشن رکھ لو۔''

ہزاری مل: ''ہاں یہ معاملے کی بات ہے لیکن دن ہو تو مال پرکھا جائے۔ تب معلوم ہو کتنے کا ہے لیکن اٹکل سے تو سب مال پچاس ساٹھ کا ہوگا۔

ماما عظمت: ''ایسا غضب تو مت کرو۔ سوا سو کی لاگت کے ہیں۔''

ہزاری مل: ''اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ تمھاری چیز سو کی ہو یا دو سو کی۔ کوئی نکالے لیتا ہے؟ تلوانے سے جتنی ٹھیرے معلوم ہو جائے گا۔''

یہ سب بندوبست کر کے ماما گھر واپس آئی اور مولوی صاحب کے خدمت گار نے پاؤں دبانے میں یہ سب حال مولوی صاحب سے بیان کیا اور محمد کامل کی ماں کے ذریعہ اصغری کو بھی معلوم ہوا۔ صبح ہوئی تو بزاز اور ہزاری مل طلب ہوئے۔ حساب میں کچھ حجت ہونے لگی۔ ماما چڑھ چڑھ کر بولتی تھی۔ بزاز نے کہا ''تو بڑھیا ٹر ٹر کیوں کرتی ہے۔ اٹھا اپنی چوڑیاں۔ تو تو پندرہ روپے کی بتاتی تھی۔ بازار میں نو روپے کی آنکتے ہیں۔'' ہزاری مل نے پہنچیاں اور جوشن سامنے رکھ دیے اور عظمت سے کہا ''نہیں صاحب یہ مال ہمارے کام کا نہیں۔''

مولوی صاحب نے بزاز اور ہزاری مل دونوں سے پوچھا: ''کیوں بھائی یہ چیزیں کیسی ہیں؟'' تب دونوں نے رات کی حکایت بیان کی اور عظمت کے منہ پر گویا لاکھوں جوتیاں پڑ رہی تھیں۔ جب حساب طے ہو گیا اور مولوی صاحب نے دینے کو روپیا نکالا تو جتنا واجبی تھا آدھا آدھا سب کا دے دیا اور کہا کہ میں نے روپیا منگایا ہے دس پانچ دن میں آتا ہے تو باقی بھی دے دیا جائے گا۔ سب لوگوں نے پوچھا کہ اور ماما کی طرف جو ہمارا نکلا وہ ہم کس سے لیں؟

غرض مولوی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ جو ماما سے لینا ہے وہ ماما سے لو اور عظمت کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''حضرت ان کا روپیا ادا کرو۔''

عظمت نے نیچی آنکھیں کر کے کہا ''میرے پاس بیٹی کا زیور ہے اس میں یہ لوگ اپنا اپنا سمجھ بوجھ

لیں۔" بیٹی کا تمام زیور تو کنجڑے، قصائی، بنیے، بزاز کے حساب میں آدھے داموں پر لگ گیا۔ ہزاری مل کے سو روپے کے واسطے رہنے کا ٹھیکرا گروی رکھنا پڑا۔ لکھا پڑھی پکے کاغذ پر ہو کر چار بھلے مانسوں کی گواہی ہوگئی۔ مولوی صاحب نے عظمت سے کہا "بس اب آپ خیر سے سدھاریے تم ایسے نمک حرام، دغا باز، بے ایمان آدمی کا ہمارے گھر میں کچھ کام نہیں۔"

اصغری: "ان میں نمک حرامی کے علاوہ ایک صفت اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ گھر میں فساد ڈلوانے کی فکر میں تھیں۔ کیوں عظمت وہ کڑاہی کی بات یاد ہے جو محمودہ کے بھائی نے فرمائش کی تھی اور تو نے میری طرف سے جھوٹ جا کر کہہ دیا تھا کہ بہو کہتی ہیں میرے سر میں درد ہے؟ بول تو سہی کب تو نے مجھ سے کہا تھا اور کب میں نے درد سر کا عذر کیا تھا۔"

عظمت: "بیوی تم کوٹھے پر قرآن پڑھ رہی تھیں۔ میں کہنے کو اوپر گئی تم کو پڑھتے دیکھ کر الٹی پھر آئی۔"

اصغری: "اور درد سر کی بات دل سے بنائی۔"

عظمت: "میں نے سوچا کہ صبح سے اب تک تم پڑھ رہی ہو اب کہاں چولھے میں سر کھپاؤ گی۔"

پھر اصغری نے اشتہار نکال کر مولوی صاحب کے سامنے ڈال دیا اور کہا "دیکھیے یہ بیوی عظمت ان گنوں کی ہیں۔ خود تو محلے کے پھاٹک سے اشتہار اکھاڑ لائی اور مکان پر لگایا اور خود اماں جان سے کہنے کو دوڑی گئی۔"

اصغری یہ باتیں کہہ رہی تھی اور مولوی صاحب کا چہرہ سرخ ہو ہو جاتا تھا ادھر مولوی صاحب نے کہا "تجھ کو نکال دینا کافی نہیں تو بڑی بدذات عورت ہے۔" یہ کہہ کر اپنے خدمت گار کو آواز دی اور کہا "بہادر" اس ناپاک کو کوتوالی میں لے جا۔ رقعے میں اس کا سب حال ہم لکھ دیتے ہیں۔"

اصغری نے مولوی صاحب سے کہا کہ "بس اب یہ اپنی سزا کو پہنچ گی۔ کوتوالی سے اس کو معاف رکھیے اور ماما کو اشارہ کیا "چل دے" بلکہ دروازے تک ماما کے ساتھ گئی۔

غرض ماما عظمت اپنے کوتکوں کے پیچھے یہاں سے نکالی گئی۔ گھر پہنچی، تو بیٹی بلا کی طرح لپٹی۔ "میں نہ کہتی تھی اماں ایسی لوٹ تو نہ مچاؤ۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا۔ ایسا نہ ہو کسی دن پکڑی جاؤ۔ تم کسی کی مانتی تھیں۔ خوب ہوا۔ جیسا کیا ویسا پایا اب سسرال میں میرا نام تو بدمت کرو۔ جہاں تمہارا خدا لے جائے چلی جاؤ۔ میرے گھر میں تمہارا کام نہیں۔ زیور کو میں نے صبر کیا تقدیر میں ہوگا تو پھر مل رہے گا۔" اس طور پر خدا خدا کر کے اصغری نے اپنے دشمن کو نکال پایا اور گھر کو عذاب سے نجات دی۔

(مراۃ العروس)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- ماما عظمت کتنے عرصے سے محمد کامل کے ہاں ملازمہ تھی؟

ii- لاٹ صاحب کی آمد پر ماما عظمت نے کیا شرارت کی؟

iii- مہاجن کی جانب سے نالش کا سن کر اصغری نے کیا کہا؟

iv- ماما عظمت کی بیٹی نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

2- اس سبق کو پڑھنے کے بعد اصغری کے کردار کی کون سی خوبیاں سامنے آتی ہیں؟

3- مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے:

اینٹ سے اینٹ بجانا، آب دیدہ ہونا، رنگ فق ہونا، جی جل جانا، خاک میں ملانا۔

(۱۹۲۸ء۔۱۹۸۲ء)

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور اردو کی معروف ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔آپ کا اور آپ کی بہن ہاجرہ مسرور کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کی روایت کو مستحکم کیا۔ان کا ناول ''آنگن'' جسے آدم جی ادبی انعام بھی دیا گیا ان کی فنی خصوصیات کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔اور اسے نقادوں نے قیام پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں ممتاز مقام کا حامل گردانا ہے۔ ''آنگن'' تحریک پاکستان کی اہم دستاویز ہے۔اس ناول میں بظاہر ایک خاندان کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ خدیجہ مستور نے بڑے فنکارانہ انداز میں برصغیر میں سیاسی تحریک اور مسلمانوں کی بیداری کی لہر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ان کا ایک ناول ''زمین'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے۔اس کے علاوہ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

آنگن

متن کا پس منظر

عالیہ نے زبردست اصرار کے بعد تعلیم کی پیشہ ورانہ ڈگری (بی۔ایڈ) کے حصول کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ پورے دس ماہ کی مسلسل رہائش کے بعد علی گڑھ سے واپس گھر لوٹی، تو اسے گھر کا پورا ماحول بدلا بدلا سا نظر آیا۔

وہ پورے دس مہینے بعد علی گڑھ سے لوٹی تھی۔ بڑے دن کی چھٹیاں گزارنے بھی گھر نہ آئی تھی۔ اماں نے بھی نہ بلایا تھا۔ بڑی چچی کے کئی خط آئے تھے کہ وہ ضرور آئے اور بھی سب حال احوال لکھنے والی وہی تھیں۔ اماں تو اتنے دنوں سے ناراض تھیں۔ اتنی مدت میں اماں نے ایک بھی خط نہ لکھا تھا۔ انہیں خبر بھی نہ تھی کہ وہ جس سے ناراض ہیں وہ راتوں کی تنہائیوں میں ان کے دکھوں کو یاد کر کے تڑپتی ہے۔ وہ اماں کو ایک لمحے کے لیے بھی ذہن سے اتار نہ سکی تھی۔ اس کے بعد اگر کوئی شدت سے یاد آتا تو وہ بڑے چچا تھے۔ گرما گرم خبریں اور غیر معمولی حالات ان کی یاد میں اضافہ کرتے رہتے۔ اس نے بڑے چچا کو کئی خط بھی لکھے مگر جواب کا انتظار ہی رہا۔

تانگے سے اتر کر وہ سب سے پہلے بڑی چچی سے ملی اور اس بے پناہ مسرت کو اپنے سینے میں سموئے۔ اماں کے لپٹ[1] گئی اور رو رو کر اماں کا سینہ تر کر دیا۔ گھر کا نقشہ کیسا بگڑا بگڑا لگ رہا تھا۔ آندھیوں اور بارشوں نے دیواروں کا رنگ چاٹ لیا تھا۔ کمروں کی سفیدی پیلی اور مریض معلوم ہو رہی تھی۔ دالان کے پردے کئی جگہ سے پھٹ کر لٹک گئے تھے۔ کریمن بوا ماضی کی یادوں کے بوجھ سے کمر جھکا کر چلنے لگی تھیں اور اماں کی پیشانی کے سامنے بہت سے سفید بال جھانکنے لگے تھے اور صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی کے پایوں میں زنگ لگ چکا تھا۔

''چھمی کے لڑکی ہوئی ہے، ساجدہ کا خط آیا تھا۔'' بڑی چچی نے اطلاع دی۔

''اوہ! پیاری چھمی اماں بھی بن گئی''۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔۔۔ پر اس کی بچی کا کرتہ ٹوپی لے کر کون جانے والا ہے، اب تو اس گھر میں ساری رسمیں مر چکی ہیں۔ وہ رنجیدہ ہو گئی۔

''شکیل کی کوئی خبر ملی بڑی چچی؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''تمھارے جمیل بھیا نے لکھا تھا کہ وہ بڑے مزے میں ہے، ڈھیروں کماتا ہے اور اڑاتا ہے، کسی کو یاد نہیں کرتا، اس کے لیے سب مر گئے ہیں، تمھارے جمیل بھیا بمبئی گئے تھے نا۔''

---

[1] جدید املا کے مطابق ''اماں سے لپٹ گئی''۔

شکیل کے نام پر بڑی چچی کی کچھ ایسی حالت ہوگئی جیسے چلچلاتی دھوپ میں ننگے پاؤں چل رہی ہوں۔
''دیکھو جس نے پیدا کیا، اسی کو بھول گیا، اکیلے عیش کرتا ہے''۔ انھوں نے لمبی آہ کھینچی۔
''ایک وہ بھی زمانہ تھا۔ جب سارے چھوٹے صبح اٹھ کر اپنے بڑوں کو سلام کرتے تھے، جو کچھ تھا سب ماں باپ کے ہاتھ میں تھا''۔ کریمن بوا بڑبڑائیں۔
ہے! بڑی چچی کتنی معصوم ہیں، عالیہ سوچ رہی تھی، بھلا جمیل بھیا بمبئی میں اسے کیوں تلاش کرتے پھریں گے۔ پتا نہیں شکیل کہاں ہوگا، پھر بھی شکر ہے کہ جمیل بھیا اپنی ماں کا دل رکھ رہے ہیں۔ ہائے کس پتھر کا بنا تھا شکیل۔
اوپر کے کمرے کی کھڑکی کھلی اور نجمہ پھوپھی کا سر جھانکا۔ کیسی ڈھل گئی تھیں نجمہ پھوپھی بھی۔ اس کا جی چاہا کہ انھیں سلام کرے مگر انھوں نے لفٹ ہی نہ دی۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ نجمہ پھوپھی کو سلام کرنے کے لیے اب انگریزی میں ایم۔ اے کرنا ہوگا۔
کریمن بوا نے بڑے چاؤ سے اس کے لیے چائے تیار کی تھی۔ اتنی مدت بعد ان کے ہاتھ کے سوکھے ہوئے پراٹھے کھانے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔
''بڑے چچا کہاں ہیں؟'' چائے پینے کے بعد اس نے پوچھا۔
''وہیں کہیں آزادی کا جھنڈا گاڑ رہے ہوں گے۔'' اماں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا اور بڑی چچی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔
''کہیں باہر تو نہیں گئے ہیں؟'' اس نے پھر پوچھا۔ وہ ان سے ملنے کے لیے سخت بے تاب تھی۔
''نہیں عالیہ، یہیں ہیں''۔ بڑی چچی نے جواب دیا۔
''بس اب تم جلدی سے ملازمت کی درخواستیں دے لو، میں بھر پائی ان مصیبتوں سے، اس اجڑے گھر میں جانے کس طرح دن گزارے ہیں، کبھی پیٹ بھر کھانا نہ ملا'' اماں نے بڑی بے باکی سے کہا۔ اس وقت وہ بڑی مغرور نظر آرہی تھیں۔
''ارے چھوٹی دلھن، میں تو اپنی جان سے زیادہ تمھارا خیال کیا ہے اور۔'' بڑی چچی سے کچھ کہتے نہ بن پڑ رہی تھی۔
''بس جناب آپ کے خیال کا شکریہ، اب آپ لوگ میری جان بخش دیں اور احسان نہ جتائیں، مجھے پتہ تھا کہ ایک دن یہی سننا ہوگا''۔
'اماں''! عالیہ نے حیران ہو کر اماں کو پکارا اور بڑی چچی کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ابھی تو امتحان کا نتیجہ بھی نہیں نکلا، کیا یہی سب کچھ سننے کے لیے اس نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہا تھا۔

اس کا جی چاہا کہ اپنے فیل ہونے کی دعائیں مانگنے لگے۔

بڑی چچی منہ پھیر کر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔۔ ''اتنی مدت بعد عالیہ آئی ہے اس سے باتیں کرو دلھن''۔۔۔ وہ جیسے رینگتی ہوئی اٹھیں۔۔۔ ''صبح سے سارا کام پڑا ہوا ہے، کچھ بھی تو نہیں کیا۔''

خدا جب دینے پر آتا ہے تو اتنا بڑا کلیجا دے دیتا ہے۔ وہ چپ چاپ بڑی چچی کو جاتا دیکھتی رہی۔

''عالیہ بیٹا خدا آپ کو پاس کر دے، آپ کے دن پھیرے، پرانا زمانہ یاد کرتی ہوں تو کلیجا منہ کو آتا ہے۔'' کریمن بوا اپنی کہے جا رہی تھیں۔ انھوں نے شاید اماں کی باتیں نہ سنی تھیں۔ نل کی موٹی سی دھار پکے فرش پر تڑ تڑ گرے جا رہی تھی اور کیاری میں پانی رینگ رہا تھا۔ بہار کے کھلے ہوئے سرخ، پیلے اور اُودے پھول اب مُرجھا چلے تھے۔

''ہائے اب مجھے کتنا سکون ملا ہے۔ اب ہمارے دن پلٹ جائیں گے۔'' اماں بڑے ذوق و شوق سے عالیہ کو دیکھے جا رہی تھیں۔ عالیہ کا دھیان بڑی چچی میں لگا ہوا تھا۔ وہ اماں کی کوئی بات نہ سن رہی تھی۔

بڑے چچا آ گئے۔ کیا آج اس کمرے میں بڑی چچی زندگی کا کام نمٹا لیں گی؟ ''بہت دن بعد دیکھا ہے آپ کو بڑے چچا''۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔

امتحان کیسا رہا؟'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

''بہت اچھا رہا، کامیابی کی پوری امید ہے۔''

''پھر اب تم ان بیکار دنوں میں خوب پڑھو، وہ میری لائبریری کی چابی اپنے پاس رکھ لو۔'' وہ اپنی شیروانی کی جیب ٹٹولنے لگے۔

''اب آپ اسے بھی تباہ کر دیجیے بڑے بھیا، مجھے بیوہ کر کے آپ کو صبر نہیں آیا میرے پاس کچھ بھی نہ رہنے دیجیے۔'' اماں آج سب سے مقابلہ کرنے پر تل گئی تھیں۔

''وہ۔۔۔ وہ، میں نے کہا جمیل کی اماں کہاں ہو؟ دو آدمیوں کا کھانا پکے گا، ذرا انتظام کرا دینا۔'' بڑے چچا بوکھلا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

''ضرور پڑھوں گی چچا، ہائے کتنی اچھی کتاب ہوگی۔'' عالیہ نے اماں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی اوپر جانے والے زینوں پر ہو لی۔

کریمن بوا، عالیہ بیٹا کو دعا کہو اور کہو کہ اللہ انھیں کامیاب کر دے، بڑے بھیا کہتے تھے کہ پرچے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔'' اسرار میاں کبھی تو تم چپ بھی رہا کرو۔ کوئی بھی مبارک موقع ہو تم

ضرور دخل دو گے۔"

عالیہ ایک لمحے کو جیسے زینوں پر جم کر رہ گئی اور پھر تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کریمن بوا، پیٹ کی ایسی مار پڑی کہ اب تم ذائقہ دار چیزوں کا مزہ تک بھول گئیں۔ تمھاری ساری زندگی کی ناکامی اور غلامی دشمن بن کر اسرار میاں کے پیچھے پڑ گئی ہے۔۔۔ اتنی دیر سے پلکوں میں اٹکے ہوئے آنسو ڈھلک کر بستر میں جذب ہو گئے۔

(آنگن)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- عالیہ کو بڑے چچا سے کیوں عقیدت تھی؟

ii- کریمن بُوا اور اسرار میاں کے تعلقات کیسے تھے؟

2- ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں ان میں سے درست جواب پر "✓" کا نشان لگائیے:

i- امتحان کے بعد سب لوگ عالیہ کو کس بات کی نصیحت کرتے تھے؟

الف۔ مزید پڑھنے کی　　ب۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی

ج۔ گھر بیٹھے رہنے کی　　د۔ سیر و سیاحت کی

ii- نجمہ پھوپھی کو سلام کرنے کے لیے کس مضمون میں ایم۔ اے کرنا کا کہا گیا ہے؟

الف۔ انگریزی　　ب۔ اردو　　ج۔ عربی　　د۔ فارسی

iii- بڑے چچا نے کتنے آدمیوں کا کھانا تیار کرنے کے لیے کہا؟

الف۔ دو　　ب۔ چار　　ج۔ سات　　د۔ دس

iv- عالیہ دس مہینے کے بعد کس شہر سے لوٹی تھی؟

الف۔ علی گڑھ　　ب۔ بنارس　　ج۔ حیدر آباد　　د۔ دہلی

3- اصل عبارت کے مطابق خالی جگہ میں مناسب لفظ یا الفاظ لکھ کر جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- ....کا نقشہ کیسا بگڑا بگڑا الگ رہا تھا۔

ii- صحن میں پڑی ہوئی لوہے کی کرسی کے پایوں میں............لگ چکا تھا۔

iii- اس کا جی چاہا کہ اپنے............ہونے کی دعائیں مانگنے لگے۔

iv- خدا جب دینے پر آتا ہے تو اتنا بڑا............دے دیتا ہے۔

v- بہار کے کھلے ہوئے سرخ، پیلے اور............پھول اب مرجھا چلے تھے۔

افسانہ

زندگی ایک کہانی ہے جو واقعات کے ٹکڑوں کی صورت میں پوری زندگی میں بکھری ہوتی ہے۔ ناول نگار پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے جب کہ افسانہ نگار زندگی کے کسی ایک واقعے یا چند واقعات کو مربوط کر کے انھیں ایک ایسی نئی صورت میں مرتب کرتا ہے جو زندگی کے عام تجربات سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک تاثر خواہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کر کے، اس انداز میں بیان کرنا کہ پڑھنے والے پر بھی وہی اثر مرتب ہو، عمدہ افسانے کی پہچان ہے مگر شرط یہ ہے کہ زندگی کو ''جیسے کا تیسا'' پیش کیا جائے۔ فنی لحاظ سے وحدتِ تاثر اور اتحادِ زمان و مکاں عمدہ افسانے کی تکنیک ہے۔

دورِ جدید میں افسانے مختلف اسالیب میں لکھے جا رہے ہیں۔ اردو میں پریم چند کا شمار اولین افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ زیادہ معروف افسانہ نگاروں میں پریم چند، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، انتظار حسین، غلام عباس، قراۃُ العین حیدر، ممتاز مفتی، اے حمید، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، بانو قدسیہ، انور سجاد، سعادت حسن منٹو اور اشفاق احمد شامل ہیں۔

(۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء)

پریم چند

اصل نام دھنپت رائے لیکن ادبی دنیا میں پریم چند کے نام سے مشہور ہیں۔ موضع پانڈے پور ضلع بنارس میں پیدا ہوئے۔ پریم چند ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز 1901ء سے ہوا جبکہ کانپور سے نکلنے والے رسالے ''زمانہ'' میں مضمون لکھنے شروع کیے۔ مختصر افسانہ نویسی کی طرح ناول نگاری میں بھی ان کے قلم نے چار چاند لگا دیے۔ پریم چند کے مشہور ناول نرملا، بازار حسن، چوگان ہستی، میدان عمل، گوشۂ عافیت اور گئودان ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد تین سو کے قریب ہے۔ مشہور مجموعے پریم پچیسی، پریم بتیسی، سوزِ وطن، زادِ راہ، واردات اور خاکِ پروانہ ہیں۔ ناول اور افسانے کے علاوہ چند ایک ڈرامے بھی یادگار چھوڑے ہیں۔

جس طرح میر دنیائے غزل کے بادشاہ ہیں۔ اسی طرح پریم چند دنیائے افسانہ میں یگانہ روزگار سمجھے جاتے ہیں۔ پریم چند کا خاص میدان دیہاتی زندگی کی عکاسی ہے۔

بدنصیب ماں

(۱)

پنڈت اجودھیاناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا۔ ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے، چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی، پختہ مکان، دو باغ کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد، بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا لازمی تھا اور وہ کئی دن تک بے حال رہی لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اسے تشفی ہوئی۔ چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند، چاروں بہویں ایک سے ایک فرمانبردار۔ جس وقت پھول متی چار پائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پاؤں دباتیں وہ اشنان کر کے اٹھتی تو اس کی ساڑھی دھوتیں، سارا گھر اِس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑا لڑکا کامتاناتھ ایک دفتر میں پچاس کا نوکر تھا۔ دوسرا اماناتھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا تیسرا دیاناتھ بی اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتاناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا اور امسال بی۔ اے اول درجے میں پاس کر کے ایم۔ اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں وہ لاابالیاں نہ تھیں۔ نہ فضول خرچیاں نہ کم اندیشیاں، جو والدین کو جلاتی ہیں اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں۔ بڑھیا گھر کی مالکن تھی۔ اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی جو بڑھاپے کو سخت گیر بنا دیا کرتی ہے مگر اِس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتا بھی نہیں منگا سکتا تھا۔

(۲)

دو مہینے گزر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے چاروں بھائی کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اِس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتاناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا ”میں تو کملا کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں۔“

اماناتھ: تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصے میں آئے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لیے کم از کم پانچ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔

دیاناتھ: مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچ ہزار اپنے ہوں گے تو پانچ ہزار کا کوئی ساجھی اور مل

جائے گا میں تو اپنے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔

کامتا: دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی آرام سے ہے، بدنصیب ہو تو راجا کے گھر میں بھی روتی رہے۔ یہ تو نصیب کا کھیل ہے۔

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ اِن سے کہا جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے حصے کے سب روپے دے دوں گا۔''

کامتاناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا ''سنتے ہو اِس کی باتیں۔''

اُما: ''جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔''

کامتا: ''اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمھاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں۔''

سیتا: ''جی ہاں یاد ہے۔''

اُما: ''اور جو کہیں تمھیں ولایت جا کر پڑھنے کے لیے وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لیے روپیا کہاں سے لاؤ گے۔ اِس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟''

کامتا: ''اور وظیفہ تمھیں ملے گا، کہو میں آج لکھ دوں۔''

اس دلیل نے سیتاناتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقع اگر اِسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لیے درکار ہوں گے۔ کملا کے لیے وہ اتنی بڑی مہربانی ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کر دے۔ بولا ''ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی۔

کامتا: ''تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کملا کی شادی کم سے کم خرچ میں کر دی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔ پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم۔اے، بی۔اے نہ سہی۔ ججمانی سے اِس کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے۔

اما: ''بغیر جہیز کا کوئی سوال نہیں۔ تیسری شادی ہے۔''

کامتا: ''یہ نہ کہو۔ وہ آج چاہیں تو دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں۔ تو یہی

صلاح کی کہ مراری لال کو جواب دیا جائے اور یہ دین دیال کے ساتھ سگائی کی جائے۔

دیا: ''اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔''

کامتا: ''اماں سے پوچھنا بے کار ہے۔ اِن کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے۔ وہی پرانے وقتوں کی باتیں! مراری لال کے نام پر اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا۔''

اما: ''وہ مانیں گی نہیں، اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی۔ دیکھ لیجیے گا گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہیں۔ اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے۔ ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو، ورنہ تاڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آجائیں تو صاف صاف کہہ دو۔ تب کیا کرلیں گی۔''

دیا: ''ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔''

کامتا: ''مجھے تو دھوکا کی چال اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ جس چیز پر ہمارا حق ہے۔ اِس کے لیے ہم لڑ سکتے ہیں۔ جس پر ہمارا حق نہیں۔ اِس کے لیے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔''

دیاناتھ: ''آپ الگ بیٹھے رہیں جا کر کہتا ہوں میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا۔ اس پر سرکار مقدمہ چلا رہی ہے۔ پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔ آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے گی۔ آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجیے گا۔''

کامتا: ''نا بھیا، میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا۔''

سیتا: ''میرا بھی استعفا ہے۔''

اما: ''اِن لوگوں کو جانے دو جی۔ ہم اور تم مل کر رنگ جما لیں گے۔ سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے۔ ضرورت تو ہمیں اور تمھیں ہے۔'' پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اِس کے زیوروں کے ہوتے اِس کے بیٹوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ سارے زیور نکال کر دیاناتھ کو دے دیے۔ اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

(۳)

دو تین مہینے اور گزر گئے زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے۔ اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں اگر اِس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری میں

ہو جاتی ہے تو اِس میں کیوں کمی کی جائے اور چاروں کرتے اپنے دل کی مگر ماں سے صلاح لے لیتے۔ یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ اِن کی باتوں میں آجاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا، اُسے بہت ناگوار گزرتا تھا لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اِسے بیع کرنے پر راضی ہوگئی۔ ہاں کملا کی شادی کے معاملے میں بیٹوں سے اِس کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ شادی مراری کے لڑکے سے ہی ہوگی۔ چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آگئی۔

پھول متی نے کہا ''ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے۔ تمھیں دس ہزار کا ایک باغ ملا۔ پچیس ہزار کا مکان، بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کملا کا حصہ نہیں ہے؟''

کامتاناتھ نے نرمی سے کہا۔ ''اماں کملا ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے اسے نقصان ہو لیکن حصے کی جو بات کہتی ہو تو کملا کا حصہ کچھ نہیں ہے۔ دادا جب زندہ تھے تب اور بات تھی۔ اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی جو کام ایک ہزار میں ہو جائے اُس کے لیے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟

کامتاناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ ہوا۔ بولے اماں تم خواہ مخواہ بات بڑھاتی ہو۔ جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو۔ وہ تمھارا نہیں ہے۔ وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔ تم ہماری مرضی کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ نہیں کر سکتیں۔''

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ ''کیا کہا، پھر تو گویا میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی۔''

کامتا: ''وہ روپے تمھارے نہیں ہمارے ہیں۔''

پھول متی: تمھارے ہوں گے لیکن میرے مرنے کے بعد۔

کامتا: نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہو گیا۔''

اما: اماں قانون تو جانتی نہیں ہے خواہ مخواہ الجھتی ہیں۔''

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دہک اُٹھیں، چہرہ لال ہو گیا۔ بولی تمھارا قانون بھاڑ میں جائے۔ ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی۔ یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ تمھارے دادا ایسے کوئی دھنا سیٹھ نہ تھے، میں نے پیٹ اور تن کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں۔ نہیں تو آج اِس گھر میں دھول اُڑتی ہوتی گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم

میرے روپے چھو نہیں سکتے۔ میں نے تم چاروں بھائیوں کی شادیوں میں دس دس ہزار روپے خرچ کیے ہیں۔ تمھاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہوں گے۔ کملا بھی تو میرے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے۔ اِس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی۔ جو کچھ بچے گا، تم لے لینا۔"

امانا تھ نے جھلا کر کہا۔ "بھائی صاحب آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے۔ یہ قاعدہ قانون تو جانتی نہیں، بے کار بحث کرتی ہیں۔"

پھول متی نے ضبط کر کے کہا۔ "اچھا کیا قانون ہے ذرا میں بھی سنوں۔"

اما: "قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گزارہ لینے کا ہے۔"

چاروں نوجوانوں پر ماں کی تندہی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی درہ اِن کی حفاظت کر رہا تھا۔ اِس کچے لوہے کا اِن پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہوگئی تھی، دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اِس کے پتوں میں بھی حس نہ تھی۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ پھول متی آہستہ سے اُٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

(۴)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اِسے معلوم ہوا کہ اِس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے لڑکے اِس کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس کا اِسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اِس نے خون جگر دے کر پالا تھا، جن پر اسے غرور تھا، وہی آج اُسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ واہ رے زمانے کی خوبی۔ اب اِس گھر میں رہنا اُسے عذاب معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اِس کی کچھ قدر نہیں، کچھ گنتی نہیں، وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے، یہ اس کی خوددار طبیعت کے لیے حد درجہ گراں تھا، مگر چارہ ہی کیا تھا۔ بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو ایک انکاری خط لکھ بھیجا۔ دین دیال سے کملا کی شادی ہوگئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے۔ لیکن روٹی دال سے خوش تھے۔ بغیر کسی قرارداد کے شادی کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ بارات آئی۔ شادی ہوگئی۔ کملا رخصت ہوگئی۔ کملا کے دل پر کیا گزر

رہی تھی، اِسے بھی کون جان سکتا تھا۔ لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا اِن کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہوگا، آرام کرے گی۔ تکلیف لکھی ہوگی...... تکلیف اُٹھائے گی۔ گھر والوں نے جس سے شادی کر دی، اس میں ہزار عیب ہوں تو یہی اس کا مالک، انحراف اس کے وہم وگمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کملا کو کیا دیا گیا۔ مہمان کی خاطر مدارت کی گئی۔ کس کے ہاں سے نوید میں کیا آیا۔ اِسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو، اچھا ہی کرتے ہو مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

کملا رخصت ہوگئی، پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(۵)

ایک سال گزر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا۔ اِس نے اِسے بڑی بہو کے لیے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہنے لگی جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اب اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ گھر کی لونڈی تھی۔ گھر سے کسی فرد سے کسی معاملے سے اِسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اِس لیے تھی کہ اسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی یا رنج کا اِس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی، کوئی آرزو، کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپایوں کی طرح کام کرنا اور کھانا، یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے۔ مگر کھاتا ہے دل سے، وہ بے کہے کام کرتی تھی مگر کھاتی کم تھی زہر کے نوالوں کی طرح، مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا۔ مہینوں کپڑے نہ دھلتے، کچھ پروا نہیں۔ اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ملیریا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل زمین پر مٹیالا پانی، نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔ پانی میں بھیگ کر سارا کام کیا۔ آگ جلائی، پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔ کامتا ناتھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے۔ نل کا پانی انھیں موافق نہ تھا۔

کامتا ناتھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "رہنے دو اماں، میں پانی بھر لاؤں گا۔ کہار اور مہری آج دونوں غائب ہیں۔"

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم بھیگ جاؤ گے بیٹا سردی ہو جائے گی۔"

"تم بھی بھیگ رہی ہو، کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔"

"میں بیمار نہیں پڑوں گی، مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے۔"

پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری پاؤں پھسلا، سنبھل نہ سکی۔ پانی میں گر پڑی۔ پل بھر ہاتھ پاؤں چلائے، پھر لہریں اِسے نیچے کھینچ لے گئیں۔ کنارے پر دو چار پنڈت چلائے۔ "ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے۔" دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ اِن بل کھاتی ہوئی لہروں میں جنھیں دیکھ کر ہی انسان سہم اُٹھتا ہے۔ ایک نے پوچھا۔

"یہ کون بڑھیا تھی؟"

"ارے وہی پنڈت اجودھیا ناتھ کی بیوہ ہے۔"

"ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا۔"

"اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں۔"

"ہاں سب ہیں بھائی، مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے۔"

(واردات)

سوالات

-1 مختصر جواب دیجیے:

-i انتقال کے وقت پنڈت اجودھیا ناتھ نے کیا اثاثہ چھوڑا؟

-ii باپ کے مرنے کے بعد ماں سے بیٹوں کا رویہ کیوں تبدیل ہو گیا؟

-iii کملا کی شادی کس سے ہوئی؟

-iv کامتا ناتھ روزانہ کیا پیتے تھے؟

-2 پھول متی کا کردار مختصراً بیان کیجیے۔

-3 افسانہ "بدنصیب ماں" کا خلاصہ قلم بند کیجیے۔

-4 مندرجہ ذیل بیانات میں صحیح بیان کے سامنے "ص" اور غلط بیان کے سامنے "غ" لکھیے:

-i پنڈت اجودھیا ناتھ نے انتقال کے وقت چار لڑکے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑے۔ غ/ص

-ii دین دیال کی عمر چالیس سال سے کم تھی۔ غ/ص

-iii پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ غ/ص

-iv پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ غ/ص

-v دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ غ/ص

-5 اس سبق میں کچھ ہندی الفاظ موجود ہیں، ان کی فہرست مرتب کیجیے۔

(۱۸۸۰ء۔۱۹۴۳ء)

سجاد حیدر یلدرم

سجاد حیدر یلدرم بنارس میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۰۱ء میں بی اے کیا۔ کالج کے زمانے میں اچھے مقرر بھی تھے اور شاعری کا شستہ مذاق بھی رکھتے تھے۔ یلدرم کو ترکی زبان اور ترکوں سے بڑی محبت تھی۔ آپ نے بہت سی ترکی کہانیوں کو اردو میں منتقل کیا اور اس طرح اردو نثر میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا مجموعہ ''خیالستان'' اردو ادب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے یوں تو انھوں نے شاعری بھی کی۔ مضمون بھی لکھے لیکن ان کا نام ایک رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انداز بیان کی لطافت ان کے ہاں ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اردو میں جس چیز کو ہم ادب لطیف کا نام دیتے ہیں۔ اسکی بنیاد بھی سجاد حیدر نے ڈالی۔ اس طرح انھوں نے ایک نئی زبان کو ترتیب دیا اور اردو نثر کو وہ دل کشی اور نفاست عطا کر دی جو اس سے پہلے صرف نظم کا حصہ تھی۔

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

میرے دوست احمد مرزا ہیں جنھیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ ان کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں ''کوئی آرہا ہے، قیامت نہیں ہے۔'' ان کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ وہ اوپر آتے ہیں اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولا آکے لگا آج تک انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں۔

''اہاہاہا! آخر تمھیں میں نے پکڑ لیا مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا مت بند کرو۔ میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ واللہ! مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا، تمھاری خیریت دریافت کرنی تھی، خدا حافظ۔''

یہ کہ کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اب وہ کہاں؟ اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم وہ اگر گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔

اور لیجیے، دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں اور رات دن انھیں کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں، تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں، جب میں کام سے فارغ ہو چکتا ہوں لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹا آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے، سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش

کروں، مگر وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں، ''ہاں بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے بچے کو بخار آ گیا۔ منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالیٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں، تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے، مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لیے ہوتے ہیں، اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ ''طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟'' کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں، اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں، جنھیں اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے سوا (تعریف اس حالت میں جبکہ انھوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسم کے دوستوں کے، میں محمد شاکر خاں صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا، کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر خاں صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انھیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہلِ علم کی تھوڑی سی قدر کرنا اُمرا کے شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے یہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہ کے ''شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیلی آب و ہوا بھی ہو گی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمھارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو میری خوشی کرو۔''

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا؟ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا، وہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی اور ایک نہایت ہی دل فریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا جب دوسرا پیالا چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ ''ہیں، ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ آرام دو اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا

لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلیے گاڑی تیار کراتے ہیں، دریا پہ مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجا طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔ میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت معلوم۔ خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا، جو میرے لکھنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد، جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتا نہیں۔ اسی طرح بہت اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا، مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں کہ ضرورت کی تھیں وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں ان کی عنایت سے خوش نہیں ہوا کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لیے، اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں شبن! سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لیے تشریف لائیے، کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں اور سرکار انھیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔"

بادلِ نخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے، ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انھیں دکھایا جاؤں گا گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جو میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں اپنے

کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے، فقرہ از سرِ نو پھر بنانا پڑا، طبیعت اچاٹ ہوگئی، بہ ہزار دقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹا ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا۔

(دروازے پر پھر دستک)

''کیا ہے؟''

''حضور کھانا تیار ہے۔ میز پر چنا جا چکا ہے۔''

''اچھا!''

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا

''ہاں''

''حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔''

''افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں، میں پھر کھا لوں گا۔ اس وقت کچھ ایسی بھوک نہیں ہے۔''

دستک

''کیا ہے؟''

''سرکار کہتے ہیں اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے مگر کھانا ٹھنڈا ہو کر بالکل خراب ہو جائے گا۔''

''اچھا بھائی لو ابھی آیا۔''

یہ کہ کے میں کھانے کے لیے جاتا ہوں، سب سے معذرت کرتا ہوں، میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں،

''چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا؟

دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا! کہ شہر میں ایسی فرصت اور خوشی کہاں؟''

سوا اس کے کہ آمنا وصدقنا کہوں اور کیا کہ سکتا تھا؟

(خیالستان)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- احمد مرزا کے آنے کا انداز کیا ہے؟

ii- محمد تحسین رات دن کس فکر میں رہتے ہیں؟

iii- شاکر خاں کو کس بات کا شوق ہے؟

iv- مقدمہ باز دوست کی کیا خصوصیات بتائی گئی ہیں؟

2- سبق ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' کا خلاصہ لکھیے۔

3- اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- حضرت کی.......... میں یہ داخل ہے کہ ان سے دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔

ii- شاکر خاں صاحب موضع.......... کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔

iii- اس کی ایک کھڑکی.......... باغ کی طرف کھلتی تھی۔

iv- میں بھی مثل اس.......... گھوڑے کے تھا جو میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا۔

4- سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

''میں جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لکھنے پڑھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب مگر اکثر میں نب ندارد، جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتا نہیں۔ اسی طرح بہت اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں۔''

5- الفاظ ومحاورات کا مطلب بیان کریں:

آمنّا وصدّقنا، ہمہ تن، نچلا نہ بیٹھنا، رطب اللسان ہونا، بادل نخواستہ

(۱۹۰۹ء - ۱۹۸۲ء)

غلام عباس

غلام عباس ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ آپ بچوں کے رسالے پھول اور تہذیبِ نسواں کے ایڈیٹر رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں آل انڈیا ریڈیو سے بھی منسلک ہو گئے۔ ریڈیو کے اردو اور ہندی رسالے ''سارنگ'' اور ''آہنگ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور ریڈیو سے وابستہ رہے۔ ملازمت کے دوران افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی اور چند کامیاب افسانے لکھے اور یوں اردو افسانہ نگاری میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ آپ کے افسانوں کے بہت سے مجموعے مثلاً ''آنندی''، ''جاڑے کی چاندنی''، ''کن رس'' اور زندگی نقاب چہرے شائع ہو چکے ہیں۔

غلام عباس جدید افسانہ نگاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی خصوصیت ان کے موضوع کا نیا پن ہے۔ لیکن موضوعات سے کہیں زیادہ ان کے سلیس اور مؤثر انداز نے انھیں پڑھنے والوں میں مقبول بنایا ہے۔

بندروالا

میں شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا وہیں ایک صاحب بھی رہتے تھے نام تو ان کا کچھ لمبا سا تھا مگر اس علاقے کے لوگوں میں وہ مسٹر شاہ کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ وہ کسی دفتر میں اونچے عہدے پر فائز تھے اور ایک چھوٹے سے خوش نما بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ بڑے خلیق اور ملنسار معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بنگلے کے باہر صبح شام دو ایک موٹریں کھڑی نظر آیا کرتی تھیں۔

میں صبح کو ٹہلنے نکلتا تو کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی خصوصاً چھُٹی کے روز۔ انھیں کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ شعروادب سے لگاؤ ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے بڑے التفات سے پیش آتے اور اپنے بنگلے پر آنے کی دعوت دیتے۔ میں اسے ان کی خوش اخلاقی پر محمول کرتا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے ٹال دیا کرتا مگر ایک دفعہ جو اُنھوں نے مجھے سہ پہر کی چائے پر مدعو کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔

مجھے معلوم تھا کہ ان کا تین چار سال کا ایک صاحبزادہ ہے جس کو میں نے کئی بار ان کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا تھا۔ بڑا بھولا بھالا پیارا پیارا۔ میں نے بازار سے ٹافیوں اور چوسنے والی مٹھائیوں کی دو تھیلیاں خریدیں اور وقتِ مقررہ پر ان کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

وہ غالباً میرے ہی منتظر تھے۔ خود پھاٹک پر مجھے لینے آئے اور میری آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک نرم اور آرام دہ صوفے پر مجھے بٹھایا۔ ڈرائنگ روم بڑے تکلف سے سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالین، دیواروں پر خوش نما تصاویر، چینی کے ظروف آرٹ کے نوادر، غرض ہر چیز ان کی خوشحالی کی غمازی کرتی تھی۔

اسی ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں ان کا صاحبزادہ چند بیٹری سے چلنے والے کھلونوں، موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک وغیرہ سے کھیلنے میں مشغول تھا، اس کو دیکھ کر مسٹر شاہ نے پیار سے کہا:

"مانی، دیکھو انکل آئے ہیں، انھیں سلام کرو۔"

لڑکا چونکا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر اس کی نظریں ابھی تک کھلونوں پر گڑی تھیں۔

"مانی بیٹے سلام کرو انکل کو۔ شاباش۔"

لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا، پھر اپنے ننھے منے ہاتھ سے پیشانی کو چھو کر مجھے سلام کیا۔ میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ٹافیوں اور چوسنے والی مٹھائیوں کی تھیلیاں اسے

دے دیں۔

''انکل کو تھینک یو کہو مانی۔''

لڑکے نے کچھ تامل کیا۔

''دیکھو! انکل تمھارے لیے کیسی اچھی سوئیٹس لائے ہیں۔ انھیں تھینک یو کہو، شاباش!''

آخر لڑکے نے اپنی باریک آواز میں آہستہ سے تھینک یو کہہ ہی دیا۔ میں نے دوبارہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''ماشاء اللہ بڑا پیارا ہونہار بچہ ہے۔ خدا عمر دراز کرے۔''

بچہ چند لمحے شرمیلے پن سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر جانے لگا۔ مگر مسٹر شاہ نے فوراً اسے روک لیا۔

''تم نے انکل کو اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔''

بچہ رک گیا۔ وہ گھر میں ایک اجنبی کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا تھا۔

''شاباش، شاباش، بتاؤ اپنا نام۔''

لڑکے نے پہلے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا پھر نظریں نیچی کر کے اپنی باریک سی آواز میں آہستہ سے کہا:

''خاکسار کو امان اللہ شاہ کہتے ہیں۔''

مسٹر شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

اتنے میں ایک خاتون ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں۔ قدرے شوخ میک اپ کیا ہوا تھا۔ عمر میں وہ شاہ سے جو چالیس سال کے پیٹے میں معلوم ہوتے تھے یقیناً آٹھ دس برس چھوٹی ہوں گی۔ مسٹر شاہ نے میری ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنی بیگم سے میرا تعارف کرایا جس پر انھوں نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنی منکسر المزاجی کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ظاہر کرتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا اور وہ ڈرائنگ روم ہی میں ایک بڑی سی میز پر چائے کے برتن سجانے میں مصروف ہو گئیں۔

میں نے مسٹر شاہ سے پوچھا: ''آپ کا صاحبزادہ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے، کس نرسری اسکول میں جاتا ہے۔؟''

''ابھی تو کسی میں نہیں۔ میں گھر پر خود ہی اس کو پڑھاتا ہوں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شروع ہی سے اسے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ مانی بیٹے، ذرا انکل کو اے بی سی تو سناؤ۔''

رفتہ رفتہ لڑکے کی جھجک دور ہوتی جا رہی تھی۔ اب کے اس نے بغیر شرمائے اے سے لے کر زیڈ تک پوری اے بی سی فر فر سنا دی۔

''اب ذرا گنتی بھی تو سنا دو۔''

لڑکے نے ذرا سے تامل کے بعد ایک سے سو تک گنتی سنا دی۔ اس کے بعد پہاڑوں کی باری آئی۔ لڑکے نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ پھر امی کی فرمائش پر انگریزی کی ایک مشہور نرسری رائم بھی گا کر سنا دی۔

اس دوران میں دو ایک بار رکا بھی مگر باپ کی صورت دیکھتے ہی اسے اپنا آموختہ جلد ہی یاد آ جاتا تھا۔

اب تو مسز شاہ بھی خاصی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں تھیں۔

''صاحب کیا بتاؤں، مسٹر شاہ کو بس یہی دھن ہے کہ لڑکے کو اسکول بھیجنے سے پہلے ہی لائق فائق بنا دیں۔ اس کی چوتھی سال گرہ میں بس چند ہی مہینے رہ گئے ہیں اس کے بعد وہ اسکول جانے لگے گا۔ مسٹر شاہ چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہی اردو کے مشہور شعر بھی اسے یاد کروا دیں، اور کچھ تو یاد کروا بھی دیے ہیں۔ غالب کا وہ کون سا شعر تھا جو۔۔۔۔۔

میں نے جلدی سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

''معاف کیجیے گا بیگم صاحبہ! آپ کا صاحبزادہ بے شک ذہین ہے مگر بے چارہ اس وقت بہت تھک گیا ہوگا۔ میں وہ شعر کسی اور روز سن لوں گا۔''

مسز شاہ بولیں۔ ''اجی آپ تھکنے کو کہتے ہیں۔ مسٹر شاہ تو صبح صبح ہی اسے اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں، اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ ورزش کراتے ہیں، اور ورزش بھی سخت قسم کی۔ وہ جاپانی کشتی جوڈو کراٹے کہلاتی ہے، اس کے بھی تو کچھ داؤ پیچ سکھاتے ہیں۔

چائے کے دوران میں بھی گفتگو کا موضوع زیادہ تر ان کا صاحبزادہ ہی رہا۔

آخر جب کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد مسٹر شاہ کے بنگلے سے نکلا تو مجھے بڑی تھکاوٹ معلوم ہوئی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک جگہ سڑک سے ہٹ کر میں نے ایک مجمع دیکھا جس میں بوڑھے، بچے، جوان سبھی دائرہ باندھے کھڑے تھے۔ ان قہقہوں کی آوازیں سن کر

میرے قدم خود بخود اس مجمع کی طرف اٹھنے لگے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بندر کا تماشا ہو رہا ہے جسے تماشائی بڑے ذوق وشوق سے دیکھ رہے ہیں۔

بندر ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی انگریزی ٹوپی پہنے تھا جسے بندر والے نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ڈوریوں سے باندھ دیا تھا۔ وہ پچھلے پاؤں پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے خوش مٹک مٹک کے اور اکڑ اکڑ کے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بندر والا ڈگڈگی بجا بجا کے کہے جا رہا تھا۔

''بس پلپلی صاحب۔ بہت ہو چکی کلفٹن کی سیر، اب گھر کو سدھارو۔۔۔۔۔ لو صاحب بہادر تمھاری میم صاحب تو ناراض ہو کر ولایت چلی گئیں۔ اب تمھیں روٹی پکا کے کون کھلائے گا؟۔۔۔۔ کیا کہا خود پکاؤ گے؟ وہ کیسے؟۔۔۔۔۔ بھئی واہ صاحب بہادر واہ تم روٹی پکانا تو خوب جانتے ہو۔۔۔۔ کیا کہا دشمن سے لڑو گے۔ لڑو گے!۔۔۔۔ بندوق چلانی آتی ہے؟۔۔۔۔ لو یہ رہی تمھاری بندوق۔۔۔۔۔ بھلا باندھو تو نشانہ! بیٹھ کر نشانہ باندھو۔۔۔۔۔ شاباش۔۔۔۔ اب کھڑے ہو کر نشانہ باندھو۔ شاباش۔۔۔۔ اب لیٹ کر نشانہ باندھو۔۔۔۔ بہت ٹھیک۔۔۔۔ شاباش! شاباش!۔۔۔۔۔ ارے یہ کیا؟ ہوائی جہاز کو نشانہ بنانا چاہتے ہو؟۔۔۔۔۔ بھئی تم تو بڑے بہادر نکلے۔ تم نے تو سچ مچ دشمن کو بھگا ہی دیا۔''

بندر نے کرتبوں کے علاوہ اور بھی کئی تماشے دکھائے۔ مثلاً سر کو ہلا کر ہاں یا نہیں کا اشارہ کرنا، ہوا میں قلابازیاں لگانا، شیک ہینڈ کرنا، دونوں ہاتھوں کے بل الٹا ہو کر چلنا، کانوں کو ہلانا وغیرہ۔

ان کرتبوں کے دوران میں بندر کبھی کبھی دانت کچکچانے یا چڑچڑانے لگتا مگر بندر والے کی لکڑی، رسی کا جھٹکا اور آنکھ کا اشارہ جلد ہی اسے راہ پر لے آتا تھا۔

بندر کا تماشا تو میں نے زندگی میں بیسیوں مرتبہ دیکھا ہوگا مگر جو مزہ آج مجھے اس تماشے کے دیکھنے میں آیا پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

میری ساری کلفت دور ہو چکی تھی۔

جب میں گھر لوٹ رہا تھا تو اچانک میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا:

بندر والا تو خیر ڈگڈگی بجا کر تماشائی اکٹھے کر لیتا ہے۔ کیا مسٹر شاہ کو اس مقصد کے لیے ہمیشہ دعوتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے؟

(زندگی، نقاب، چہرے)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- مسٹر شاہ کے بچے کی عمر کتنی تھی؟

ii- بچے نے اپنا نام کیا بتایا؟

iii- مسٹر شاہ کے بنگلے سے نکل کر مصنف نے کیا دیکھا؟

iv- بندر کا تماشا دیکھنے کے بعد مصنف نے کیسا محسوس کیا؟

2- سبق ''بندر والا'' کا مرکزی خیال تحریر کیجیے:

3- ذیل میں ہر سوال کے چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں درست جواب پر ''✓'' کا نشان لگائیے:

i- لڑکے نے کچھ............کیا۔

ا۔ تامل ب۔ اِصرار ج۔ انکار د۔ اقرار

ii- ماشاء اللہ بڑا پیارا............بچہ ہے:

ا۔ ہونہار ب۔ بدصورت ج۔ بدتمیز د۔ لائق

iii- تم نے............کو اپنا نام بتایا ہی نہیں۔

ا۔ انکل ب۔ خالو ج۔ چچا د۔ ماموں

iv- باپ کی صورت دیکھتے ہی اسے اپنا............جلد ہی یاد آ جاتا تھا۔

ا۔ آموختہ ب۔ سبق ج۔ نام د۔ گھر

v- ایک جگہ سڑک سے ہٹ کر میں نے ایک............دیکھا۔

ا۔ مجمع ب۔ جلوس ج۔ ہجوم د۔ حادثہ

vi- میر ساری............دور ہو چکی تھی۔

ا۔ کلفت ب۔ خوشی ج۔ افسردگی د۔ تھکن

4- سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

''اتنے میں ایک خاتون ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی میں ملبوس ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں۔ قدرے شوخ میک اپ کیا ہوا تھا۔ عمر میں وہ شاہ سے جو چالیس سال کے پیٹے میں معلوم

ہوتے تھے یقیناً آٹھ دس برس چھوٹی ہوں گی۔ مسٹر شاہ نے میری ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنی بیگم سے میرا تعارف کرایا جس پر انھوں نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنی منکسر المزاجی کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ظاہر کرتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا اور وہ ڈرائنگ روم ہی میں ایک بڑی سی میز پر چائے کے برتن سجانے میں مصروف ہوگئیں۔"

(ولادت:۱۹۱۴ء)

احمد ندیم قاسمی

احمد شاہ نام، احمد ندیم قاسمی ادبی نام ہے۔ انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد بہاولپور کالج میں داخل ہو گئے اور یہیں سے بی اے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں محکمہ آبکاری میں ملازم ہو گئے لیکن بعد میں مستعفی ہو کر لاہور چلے آئے۔ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' کی ادارت سنبھال لی۔ ''ادب لطیف''، ''نقوش'' اور ''فنون'' کی بھی ادارت کی۔ تقسیم کے بعد ڈیڑھ سال تک ریڈیو پاکستان پشاور میں ملازم رہے۔ ۱۹۷۶ء میں مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر بنا دیے گئے۔

ندیم صاحب کی شاعری کا آغاز پندرہ برس کی عمر سے ہوا۔ آپ کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے دو مجموعے ''جلال و جمال'' اور شعلہ گل نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہیں۔ ''رم جھم'' میں قطعات ہیں۔ چوتھا مجموعہ ''دشتِ وفا'' ہے جس پر انھیں آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔ شاعر ہونے کے علاوہ آپ ایک افسانہ نگار بھی ہیں، جس میں آپ نے پنجاب کے دیہات اور یہاں کے ماحول کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ حقیقت نگاری، روشن خیالی اور انسانی عظمت ان کے انداز تحریر کے نمایاں پہلو ہیں۔

گھر سے گھر تک

حاجی مقتدا احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نورالزمان کی بیوی عشرت خانم، ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وَقار کا سارا رعب داب صابن کے جھاگ کی طرح آناً فاناً غائب ہوگیا۔ یہ لوگ جس کار میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوائی اڈے پر کھلے دروازوں کے ساتھ کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی گلی میں مڑتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لیے خاصی دقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی ہی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی جی چاہتا تھا کہ اسے چھونا اور محسوس کرنا چاہیے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس ٹھاٹھ کی کار کو چھونا یقیناً خلافِ قانون ہوگا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدا احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باوردی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم، ہما اور وَقار پھول میں سے بھونروں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تڑاخ تڑاخ بند کیے تو گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدھی لٹکتی ہوئی لڑکیوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیں بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر مونچھیں مروڑنے لگا۔

حاجی مقتدا احمد کی بیوی نورالنساء نے دروازے پر عشرت خانم، ہما اور وَقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیسٹری کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پائدان پر ذرا دیر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا ارتکاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انھوں نے قالین پر قدم رکھا تو ڈگمگا گئیں جیسے پھسلنے سے بچی ہیں۔ پلٹ کر انھوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پائنچوں کو ذرا سا اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نورالنساء نے سلیپر پائدان پر اتار دیے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلنگ میں لپٹے ہوئے ایک

مونڈھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نورالنساء چونک کر بولیں۔ ''اے ہے وقار میاں، یہ کیا کر رہے ہو؟ اے بہن عشرت خانم، اسے سمجھائیے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں مونڈھے ہی پر ٹک گیا۔ اٹھو میاں اٹھو صوفے کس لیے رکھے ہیں؟''

عشرت خانم نے وقار سے کہا: ''سن رہے ہو میاں، تمھاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں۔''

وقار کچھ اس طرح چل کر صوفے کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر زینہ اترا ہے۔

اس کے بعد تکلّفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتی جانے لگی، موسم کی بوالعجبیوں کا ذکر چلا۔

پھر نورالنساء اٹھیں۔ ''ہائے میں نے معصومہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمھاری خالہ جان آئی ہیں۔''

وقار جو دائیں ٹانگ کو بائیں ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا۔ بائیں ٹانگ کو دائیں ٹانگ پر رکھ کر اور ہما کی طرف دیکھتے ہوئے یوں سکڑا جیسے کہہ رہا ہے۔ ''دیکھیے باجی، انھیں منع کر لیجیے۔''

ہما سر سراتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی اٹھی اور مسکرا کر بولی ''آپ تشریف رکھیے خالہ جان، معصومہ کو میں لیے آتی ہوں۔''

نورالنساء فوراً بولیں ''نہیں نہیں ہما بیٹی تم بیٹھو میں نوکروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔''

نورالنساء سلیپر پٹخاتی سیڑھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولیں ''دیکھا اماں! میں نہ کہتی تھی؟''

''اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔'' عشرت خانم بولیں ''سمجھ میں نہیں آتا حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بٹور رکھی ہے؟''

''غالیچہ دیکھیے جیسے سمندر کا جھاگ ہے۔'' ہما نے ہاتھ بڑھا کر غالیچے میں انگلیوں کی پوریں ڈبو دیں۔ ''پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار کا تو ہوگا۔''

''ایک ہزار کا؟'' وقار پہلی بار بولا: ''کمال کرتی ہیں باجی۔ دس ہزار کہیے۔''

''آہستہ بولو'' ہما نے آہستہ سے کہا۔ ''جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمھاری باتیں سن رہا ہے۔''

''دس ہزار کا اگر صرف یہ غالیچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہوگا۔'' عشرت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑائیں۔ ''ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے، منہ میں سماتی ہے، جیب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔''

ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی، چمکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی: ''خالص ریشم کے تو پردے ہیں۔'' پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی: ''یہ دیکھیے۔ ذرا سی شکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی لہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھیے۔'' ہما نے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔

''اے رہنے دے۔'' عشرت خانم نے سرزنش کی۔ ''کیا کر رہی ہے پردہ گر پڑے گا۔'' پھر دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے پردے گنتی ہوئی بولیں: ''ایک دو تین چار پانچ اور چھے۔ اکٹھے چھے پردے ہیں ایک جیسے۔''

''کچھ نہیں تو چھے سو کے تو یہی ہوں گے۔'' ہما بولی۔

''لیجیے اور سنیے وقار تڑپ اٹھا۔'' باجی تو کمال کر رہی ہیں، دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجیے مجھ سے۔''

''صوفا دیکھیے بالکل نئے فیشن کا ہے۔'' ہما نے تبصرہ جاری رکھا ''تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائبات دیکھیے! وقار، مینٹل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟''

وقار نے ہرن کی طرف جوہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی قیمتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے شائد عقیق کا ہے۔''

''عقیق کا؟'' عشرت ہرن کو دیکھنے کے لیے آدھی اٹھ گئیں۔ ''بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔'' جھوم کر کہا: ''ایسے ٹھاٹھ کہیں نظر نہیں آئے۔''

عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں: ''اتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہوگی۔''

''میں نے تو کہا تھا پہلے دیکھ داکھ لیجیے۔'' وقار نے کہا۔

''ہما سے پوچھو۔'' عشرت خانم بولیں۔ ''مجھے تو یہی گھسیٹے لیے پھر رہی ہے۔''

''تو کیا ہے اماں؟'' ہما بولی: ''اس میں نقصان کون سا ہے۔ اتنا بہت سا جہیز ملے گا؟''

''تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں۔'' عشرت خانم اداس ہو گئیں۔ ''بتاؤ کیا ملا؟''

''چپ'' ہما نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آ رہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشمی پردے کے ادھر چینی کے برتن بجنے لگے تھے۔

نورالنساء پردہ ہٹا کر بولیں: ''آجا بیٹی۔ شرمانے کی کون سی بات ہے اپنی خالہ ہیں۔ اپنی باجی ہما ہیں جن سے تو سلیمہ کے ہاں ملی تھی۔ سب اپنے ہیں۔ آجا۔''

معصومہ کی صورت میں ریشم اور نائلون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہما نے معصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نورالنساء نے معصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا۔

معصومہ نے ایک دو بار سر پر سے کھسکتے ہوئے دوپٹے کو درست کرنے کے لیے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سے اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بدصورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہما معصومہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر ''جی یا جی نہیں'' سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار معصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نورالنساء معصومہ کی سلیقہ مندیوں اور کشیدہ کاریوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم ''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ'' سے جواب دیتی رہیں۔

پھر جب لٹھے کی صاف ستھری شلوار قمیض میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکایا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گونگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے منقش پلاسٹک پر انھیں ایسی کراکری نظر آئی، جس کے بارے میں انھوں نے بازار میں گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برتنوں کے لیے دو ہی جگہیں مناسب ہیں۔ دکانوں کے شوکیس یا وزیر وزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا۔ جس کے بارے میں ہما نے انھیں بتایا تھا کہ منیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ عشرت خانم نے سوچا یہ تو خاصے کھاتے پیتے چھلکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک ریفریجریٹر کی کمی نے ٹھیس پہنچا رکھی تھی یا معصومہ کی انتہا درجے کی شرم و حیا نے۔ معصومہ نے نہ بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی۔ نہ کوئی پلیٹ اٹھا کر وقار چھوڑ، ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا قہقہہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر گڑ جاتیں اور اس کی بھنوؤں کے کٹیلے پن اور آنکھوں کے ہوشربا طول و عرض سے لے کر اس کی لمبی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آتیں، وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو

ذرا ذرا سا چھکتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر پرچ میں اسے یوں کوئی آواز پیدا کیے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دونوں گتے سے بنی ہیں۔

''حاجی صاحب جب عدن میں بزنس کرتے تھے۔'' تو نورالنساء نے بتایا۔ ''تو وہ دنیا جہاں کے عجائبات اپنے گھر میں بھرتے رہے، چھ قسم کے تو صرف چائے کے روسی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انھوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جوادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہوگا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط وکتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالینوں کے سوداگر ہیں۔ ایک بار انھیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرایا تو ایک دوسال اندر ساگوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کرلیں۔ میں چیخی چلائی تو بجائے اس کے کہ نیلام کردیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آجاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہوگا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہوگی۔ پھر جب اتنے بڑے بنگلے میں ایک نیا تنکا تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انھوں نے واپسی کا فیصلہ کرلیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آکر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ معصومہ اس وقت یہی کوئی پانچ سال کی ہوگی۔ اسے بھی یاد ہوگا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر امنڈ پڑا تھا۔ یاد ہے بیٹی؟''

''اور بہن عشرت خانم۔'' نورالنساء نے کہنا شروع کیا۔ ''واپس وطن آکر——''

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف ستھرے ملازم نے اندر آکر پوچھا۔ ''اور چائے لادوں بی بی؟''

لے آؤ۔ نورالنساء فوراً بولیں۔

عشرت خانم اور ہما چلا اٹھیں۔ ''نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی اور ملازم بڑے ادب سے وہیں کھڑا رہا۔

سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے لیے نورالنساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خانم کی طرف متوجہ ہوئیں مگر فوراً سیدھی ہو بیٹھیں اور بولیں: ''ضرورت ہوئی تو بلالیں گے جاؤ۔''

ملازم چلا گیا تو نورالنساء بولیں: ''تو بہن۔ وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آکر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس

کمرے میں بھی جائیے۔ کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ معصومہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں۔ انھیں ترتیب سے لگانے کا سلیقہ معصومہ کا ہے۔''

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔'' عشرت خانم بولیں۔

''سلیقہ ہی تو سب کچھ ہے۔'' ہما بولی۔ ''ورنہ مشین تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔''

وقار اپنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آ کر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر معصومہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر نور النساء نے کہا: ''ادھر آج میری بیٹی جمیلہ کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صبح سے دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ معصومہ کو اجازت دیجیے کہ جا کر انھیں سنبھالے۔ چائے پینے میں کپڑے سان لیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' عشرت خانم بولیں۔

''میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوئی۔'' نور النساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں، بیٹی اور بیٹا چپ چاپ بیٹھے رہے۔ جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکرا گئے ہیں۔

''اماں جی۔'' ہما بولی، ''دیکھا؟''

عشرت خانم ابھی جواب نہیں دے پائی تھیں کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ ''بی بی جی۔''

''کیا بات ہے؟'' عشرت خانم جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں: ''بس کوئی پانچ منٹ میں۔ زیادہ نہیں۔'' ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ عشرت خانم نے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ ذرا دیر کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں: ''تم دونوں یہیں بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نور النساء کے نواسوں کو ایک ایک روپیا دے آؤں۔''

''ایک ایک روپیا؟'' ہما بولی۔ ''نہیں اماں۔ دو دو دیجیے گا۔ کیوں وقار؟''

''اماں کی مرضی ہے۔'' وقار بولا۔

دو دو دے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟ عشرت خانم سوچنے لگیں۔ ہما نے بڑی ناگواری

سے کہا: ''افوہ اماں، کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دیجیے گا دو دو۔''

عشرت خانم نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر جانے لگیں۔ سیڑھیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نورالنساء اتر رہی تھیں۔ انھوں نے عشرت خانم کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے ہکابکا رہ گئیں۔ پھر بولیں: ''اے بہن! دیوان خانے میں جا کر بیٹھیے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟''

''یونہیں ذرا جی چاہا کہ اوپر سے بھی ہو آؤں۔'' عشرت خانم نے مسکرا کر کہا ''دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے ہی میں ملتا ہے اور میں گھریلو عورت ہوں۔ آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلیے۔ ملا دیجیے ان سے۔''

''میں انھیں نیچے ہی بلائے لیتی ہوں۔'' نورالنساء بضد رہیں۔ ''ایک تو اوپر بچوں نے دنیا جہاں کا کوڑا کباڑ جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے۔''

''تو کیا ہوا؟'' عشرت خانم نے اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور نورالنساء کا بازو پکڑ کر کہا: ''آیئے۔''

''نیچے ہما بیٹی اور وقار کیا کہیں گے کہ..........'' نورالنساء نے احتجاج کیا۔

''کچھ نہیں کہیں گے۔ عشرت خانم نے نورالنساء کو کھینچا۔ ''میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں۔''

نورالنساء چپ چاپ عشرت خانم کے ساتھ ہولیں۔

آخری سیڑھی تک پہنچی تھی کہ معصومہ کی کھنکتی ہوئی آواز گوش زد ہوئی۔

''اے کلثوم، اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے سنے ہوئے ہاتھ لیے میرے کپڑوں کی طرف بڑھا رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہ انھیں گنجلنے چلا ہے۔ سلیمہ کیا کہے گی کہ..........''

یکا یک نورالنساء نے اونچی آواز میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا بہن کہ آپ کو کس کمرے میں لے جاؤں۔ آج تو یہ یہاں سے وہاں تک بچوں کا گھر بنا ہوا ہے۔ وہ اٹھا پٹخ مچائی ہے انھوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔'' پھر جس طرح انھوں نے یکا یک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یکا یک رک گئیں اور چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہیں۔

عشرت خانم نے اپنی میزبان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں: "ادھر بچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو ...." نور النساء جیسے رونے کے قریب پہنچ گئیں، مگر عشرت خانم کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہولیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لیے!" عشرت خانم دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نور النساء نے قدم روک لیے جیسے اپنی بیٹی سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپٹے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سرا اٹھا کر کواڑ سے اٹکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ادوائن کا ایک کھٹولا پڑا تھا۔ جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پائنتی کے پاس پانچ چھے برس کا ننگا زاہد کھڑا چائے سے سنی ہوئی انگلیاں چوس رہا تھا۔ اکھڑے ہوئے سیمنٹ کے فرش پر مختلف عمروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بجھنگ پتیلی میں تھی، چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ مٹی کا پیالہ تھا تو کسی کے سامنے مراد آبادی کٹورا رکھا تھا۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی، جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی، ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی تپش سے بچانے کے لیے ایلومونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس کو اپنی فراک میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا رکھا تھا کہ اس کا ننھا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلثوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے مکھیوں نے سیاہ کر ڈالا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار قمیض پر ایک چھلنی چھلنی دوپٹا اوڑھے ننگے پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھو لیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی لمبی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونٹوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خانم دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نور النساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نور النساء۔" وہ پکاریں، جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نور النساء جلدی جلدی سے برتن سمیٹ رہی ہیں۔ "بہن" انھوں نے کہا اور نور النساء سناٹے میں آ گئیں۔ پھر بولیں۔ "یہ باورچی خانہ ہے مگر بچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنا رکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو ...."

پھر وہ خاموش ہوگئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خانم ہنس رہی تھیں۔

معصومہ پرلے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی ایک دو ہی لمحوں کے اندر مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہونے والی ہے۔

عشرت خانم ہنسے جارہی تھیں اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ''ہائے میرے اللہ'' وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ ''توبہ ہے۔'' انھوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔

نورالنساء کے ایک ہاتھ میں پتیلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا سر تھا اور وہ یوں بیٹھی تھیں جیسے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ہیں۔

عشرت خانم پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ ''اے بہن معاف کرنا'' وہ بولیں۔ ''آپ نے مجھے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ پچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میلی دیواریں اور یہ پرانے دوپٹوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے؟ یہ ننگے اور اُدھ ننگے بے دُھلے بے نہائے بچے، وہ ٹوٹا ہوا کھٹولا اور یہ بے گُنڈے کا توا۔ اے بہن نورالنساء! آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹیے بہن!'' عشرت خانم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تام چینی کی چوٹ لگی پلیٹیں ہیں جن کے کناروں پر چنے کی دال اب تک جمی ہوئی ہے۔ ادھر معصومہ بٹی کے کمرے میں جو چارپائی رکھی ہے اس کی ادوائن کو پورا کرنے کے لیے اس میں کسی کا کمربند بھی تو باندھ دیا گیا ہے۔'' عشرت خانم نے یہاں رک کر دو تین قہقہے مارے۔ پھر آنکھیں پونچھنے کے لیے اپنے دوپٹے کا پلو پکڑا مگر دوپٹے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نورالنساء کو یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھند میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ ''بہن'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئیں۔

عشرت خانم باورچی خانے میں داخل ہو کر نورالنساء کے پاس بیٹھ گئیں۔ نورالنساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے بینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

''دیکھیے بہن مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔'' عشرت خانم نے کہا۔ ''نیچے سیڑھیوں میں۔ الگ۔

نورالنساء گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک پٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک ٹہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔

عشرت خانم منہ میں دوپٹے کا پلو ٹھونسے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیڑھیاں اتر گئیں۔ پھر رک کر اوپر دیکھا۔ نورالنساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیڑھیوں کے جنگلے کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خانم کے قریب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اترتی چلی گئیں۔ مگر عشرت خانم نے ان کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ پھر انھیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ سے دوپٹہ نکالا اور بجائے بولنے کے ہنسنے لگیں۔

''جوتیاں مار لیجیے بہن عشرت خانم۔'' نورالنساء کی کہیں دور سے آواز آئی۔'' پر یہ جو آپ کی ہنسی.........''

نورالنساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نورالنساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں مگر جب تک وہ سیڑھیاں اترتیں، ایک لڑکے نے دروازہ کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا۔''بی بی جی سلام۔ آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہمان چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجیے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفا اور پردے بے شک کل تک رکھے رہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگا لیں گے۔ صبح سویرے ہمارے ہاں بھی مہمان آرہے ہیں۔''

نورالنساء آخری سیڑھی پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں انھوں نے صرف گردن کی جنبش سے ''اچھا'' کہا۔ لڑکا دھڑ سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نورالنساء آخری سیڑھی پر جیسے گر پڑیں۔

''ڈرائیور'' عشرت خانم زور سے پکاریں اور دیوان خانے کا پردہ ہٹا کر ہما نے جھانکتے ہوئے پوچھا۔''کیوں اماں جی۔ کیا ہے؟''

''میں نے ڈرائیور کو بلایا ہے۔ تم اندر بیٹھو۔ عشرت خانم بولیں ''اور دیکھو صوفے پر احتیاط سے بیٹھو۔ کپڑوں میں شکن نہ آئے۔ تمھاری سہیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور مچل کر اور جھتے ڈال کر واپس کیے۔''

''اماں'' ہما کے سینے پر عشرت خانم نے جیسے مُکّا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں۔ اس زمانے کی ''لڑکیاں''۔'' عشرت خانم نے نورالنساء کے پاس آخری سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''مانگے کے کپڑے یوں پہنتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دیے

ہیں۔" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ادھر پہلی بار نور النساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

"ڈرائیور" عشرت خانم نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں۔

"بھئی دیکھو۔ تم کار واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ ٹانگے سے آجائیں گے بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لیے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ کہنا بہت بہت شکریہ۔" پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں: "یہ لو۔ تمہارا انعام ہے۔"

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خانم دروازہ بند کر کے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نور النساء سے لپٹ کر بولیں: "اے بہن نور النساء خدا کے لیے ہنسیے۔ کیا یہ ہنسی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر سے نکل کر کسی دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جا نکلے اور بہن میری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔"

اب نور النساء کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

باہر کار سٹارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا۔ "اماں جی۔ کار تو جا رہی ہے۔"

"جا رہی ہے تو جانے دو۔" عشرت خانم بولیں: "کیا تمہارے باپ کی کار ہے؟"

وقار تیورا کر پیچھے ہٹ گیا اور نور النساء پہلی بار قہقہہ مار کر عشرت خانم سے لپٹ گئیں۔ دونوں کی ہنسی وقار اور ہما کو ایک بار پھر دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی۔ جہاں وہ ریشمی پردہ ہٹا کر بلوں کی سی گول گول حیران حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے اور سیڑھیوں کے پہلے موڑ پر معصومہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے ٹوکری کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس میں سے کبوتر نکال لیا ہے اور عشرت خانم کہہ رہی تھیں "ہائے بہن نور النساء میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے ہیں۔ قسم قرآنِ مجید کی پسینا سرخی پوڈر بہا لے جائے تو نیچے سے کیسے سچے اور کھرے چہرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آ رہا ہے آپ پر! آیئے ذرا دیر کو اوپر باورچی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں۔"

(گھر سے گھر تک)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- عشرت خانم اور وقار کی آمد کا حال اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

ii- حاجی مقتدا احمد کے کمرے کی سجاوٹ کا نقشہ کھینچیے۔

iii- عشرت خانم اور نور النساء پر ایک دوسرے کی اصلیت کا بھانڈا کیسے پھوٹا؟

iv- عشرت خانم نے باورچی خانے میں کیا دیکھا؟

2- افسانے ''گھر سے گھر تک'' کا خلاصہ لکھیے۔

3- اس افسانے میں ہمارے کس معاشرتی رویے کی نشاندہی کی گئی ہے؟

4- مندرجہ ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

ماشاءاللہ، آناً فاناً، کلیجہ دھک سے رہ جانا، اونے پونے بیچنا، دھما چوکڑی مچانا، پیٹ میں بل پڑنا

5- مندرجہ ذیل بیانات میں صحیح بیان کے سامنے ''ص'' اور غلط بیان کے سامنے ''غ'' لکھیے۔

i- نور النساء اور عشرت بیگم دو سگی بہنیں تھیں۔ ص / غ

ii- ہما کے باپ کا نام حاجی مقتدا احمد تھا۔ ص / غ

iii- عشرت خانم، ہما اور وقار مانگے کی کار میں آئے تھے۔ ص / غ

iv- حاجی مقتدا احمد اپنے ڈرائنگ روم کا سامان عدن سے لے کر آئے تھے۔ ص / غ

v- عشرت خانم نے نور النساء کے باورچی خانے کا حال دیکھا تو اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ص / غ

vi- ہما نے جو کپڑے پہنے تھے، وہ نئے سلوا کر لائی تھی۔ ص / غ

vii- عشرت خانم باورچی خانے میں پہنچیں تو معصومہ باورچی خانے کے ننگے فرش پر کھڑی تھی۔ ص / غ

ڈراما

ڈراما یونانی لفظ ''ڈراؤ'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ''کرنا یا کر کے دکھانا''۔ یہ تعریف مختصر ہونے کے باوجود کافی جامع ہے۔ کیونکہ اس میں ''عمل'' پر زور دیا گیا ہے جس کے بغیر ڈرامے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ڈرامے سے انسان کی دلچسپی فطری ہے۔ ڈرامے میں اسٹیج بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ کرداروں کی گفتگو ڈرامے کا ضروری جزو ہے۔ تاثر کے اعتبار سے ڈرامے کی دو بنیادی اقسام ہیں۔ المیہ اور طربیہ۔

امانت علی لکھنوی کو اردو کا پہلا ڈراما نگار کہا جاتا ہے جن کا ڈراما ''اندر سبھا'' لکھنؤ کے قیصر باغ میں کھیلا گیا۔ مرکزی کردار لکھنؤ کے بادشاہ واجد علی شاہ نے ادا کیا۔ آغا حشر کے ڈرامے اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ دیگر اہم ڈراما نگاروں میں امتیاز علی تاج اور میرزا ادیب کا نام بڑا نمایاں ہیں۔ اردو ڈرامے کی ترقی جس میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا بھی اہم کردار ہے۔

ٹی وی ڈرامہ نگاروں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، سلیم احمد، حسینہ معین، فاطمہ ثریا بجیا، اطہر شاہ خاں، سلیم چشتی، امجد اسلام امجد، حمید کاشمیری، منو بھائی، انور سجاد، یونس جاوید، جمیل ملک، انور مقصود اور عبدالقادر جونیجو کے نام سرِ فہرست ہیں۔

(۱۸۷۹ء۔۱۹۳۵ء)

آغا حشر

اصل نام محمد شاہ ہے۔ آغا حشر کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۸۷۹ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ تعلیم وتربیت بنارس میں ہوئی۔ آپ کے والد مذہبی معاملات میں قدامت پسند تھے، اس لیے آغا حشر ابتدا میں انگریزی تعلیم سے محروم رہے۔ آغا حشر موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ چھوٹی عمر میں شعر کہنے لگے اور فائز بنارسی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ آپ نے نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی لیکن اردو ادب میں آپ کا نام ڈراما نگاری کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ آغا حشر شروع سے تھیٹر سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اب اسٹیج اور ڈرامے کا انداز بہت تبدیل ہوگیا ہے لیکن آغا حشر کی ڈراما نگاری کی تاریخی اہمیت برقرار ہے۔ انھوں نے ڈراما نگاری کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق اور فن کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے اپنی تخلیقات کو فن کے نقطۂ نظر سے بھی بلند کیا۔ ان ڈراموں میں ''اسیر حرص''، ''صید ہوس''، ''سفید خون''، ''خواب ہستی''، ''خوبصورت بلا''، ''سلور کنگ عرف نیک پروین''، ''ترکی حور''، ''یہودی کی لڑکی'' اور ''رستم وسہراب'' بہت مشہور ہیں۔

اردو ڈراما نگاری میں جو شہرت حشر کو ملی، وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ انھوں نے ہر دور میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک عوامی فنکار تھے۔

رستم وسہراب

چھٹا سین

(میدانِ جنگ)

(رستم اداس چہرے اور غمگین دل کے ساتھ مایوس نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔)

رستم: پروردگار! میں نے کبھی تیرے قہر وغضب کو حقیر نہیں سمجھا۔ کبھی تیری طاقت کے سامنے اپنی فانی طاقت کا غرور نہیں کیا۔ پھر اس ذلت کی شکل میں تو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ اے دردمندوں کی دوا اور کمزوروں کی طاقت! اے نامیدوں کی امید! میں نے کل ساری رات تیرے حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر مدد کے لیے التجا کی ہے۔ اپنے عاجز بندے کی التجا قبول کر۔ اس بڑھاپے میں دنیا کے سامنے میری شرم رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور وجوش مجھے دوبارہ واپس دے دے۔

تری قدرت پلٹ سکتی ہے سارے کارخانے کو
پھر اک دن کے لیے تو بھیج دے پچھلے زمانے کو

(سہراب کا داخلہ)

سہراب: صبح ہوگئی۔ ممکن ہے یہ آج کی صبح اس کی زندگی کی شام ثابت ہو۔ نہ جانے کیا سبب ہے کہ اس کی موت کا خیال آتے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے (رستم کو دیکھ کر) تو آگیا؟ کیا جنگ کے نقارے کی پہلی چوٹ سے تیری نیند ٹوٹ گئی؟

رستم: بہادر اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔ میں آدھی رات سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

سہراب: آج لڑائی کا دوسرا دن ہے جانتا ہے اس جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا؟

رستم: ہم دونوں میں سے ایک کی موت!

سہراب: شیر دل بوڑھے! میرا دل تیری موت دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایک غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔ اگر ایران کی گود بہادر فرزندوں سے خالی نہیں ہے تو جا واپس جا اور اپنے عوض کسی اور ایرانی دلیر کو بھیج دے۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ

لوٹ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔

رستم: کل کی اتفاقی فتح پر غرور نہ کر۔ ہر نیا دن انسان کے لیے نئے انقلاب لے کر آتا ہے۔ تقدیر کا پہیا ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا۔

گھڑی بھر میں بدلنا ہوگا تجھ کو پیرہن اپنا ؎
منگا کر پاس رکھ لے جنگ سے پہلے کفن اپنا

(جنگ شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد سہراب ہاتھ روک لیتا ہے)

سہراب: آج میں تجھ میں نیا جوش اور نئی قوت دیکھ رہا ہوں۔ جواں ہمت بوڑھے! مجھے پھر شک ہوتا ہے کہ تو رستم ہے۔ میں تیری عزت کا واسطہ اور تیری بہادری کی دہائی دے کر ایک بار پھر تیرا نام پوچھتا ہوں۔ زور سے نہیں، منت سے! غرور سے نہیں، عاجزی سے!

رستم: تو میرا نام ہی جاننا چاہتا ہے تو سن میرا نام ہے.........

سہراب: (خوشی کی گھبراہٹ سے) رستم!

رستم: نہیں! سہراب کی موت۔

سہراب: افسوس تو نے میرے رحم کی قدر نہیں کی۔

(دوبارہ جنگ ہوتی ہے۔ رستم سہراب کو گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔)

رستم:
بس اسی ہمت اسی طاقت پہ تھا اتنا غرور
تو کوئی شیشہ نہ تھا کیوں ہو گیا پھر چُور چُور
کیا ہوا زورِ جوانی اٹھ اجل ہے گھات میں
دیکھ لے اب کس قدر قدرت ہے بوڑھے ہات میں

(سہراب کے سینے میں خنجر بھونک دیتا ہے)

سہراب: آہ! اے آنکھو! تمھارے نصیب میں باپ کا دیدار نہ تھا کہاں ہو؟ پیارے باپ کہاں ہو؟ باپ کہاں ہو؟ آؤ آؤ کہ مرنے سے پہلے تمھارا سہراب تمھیں ایک بار دیکھ لے۔

کیا خبر تھی کہ بگڑ جائے گی قسمت اپنی ؎
آخری وقت دکھا دو مجھے صورت اپنی

رستم: اپنی جوانی کی موت پر ماتم کرنے کے لیے باپ کو یاد کر رہا ہے؟ اب تیرے باپ کی محبت، اس کے آنسو، اس کی فریاد، کوئی تجھے دنیا میں زندہ نہیں رکھ سکتی۔

مرہم کہاں جو رکھ دے دل پاش پاش پر
آیا بھی وہ تو روئے گا بیٹے کی لاش پر

سہراب: بھاگ جا۔ بھاگ جا۔ اس دنیا سے کسی دوسری دنیا میں بھاگ جا۔ تو نے سام ونریمان کے خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے۔ تاریک جنگلوں میں پہاڑوں کے غار میں، سمندر کی تہ میں، تو کہیں بھی جا کر چھپے لیکن میرے باپ رستم کے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔

رستم: (چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے) کیا کہا؟ کیا کہا؟ تو رستم کا بیٹا ہے؟

سہراب: ہاں۔

رستم: تیری ماں کا نام؟

سہراب: تہمینہ۔

رستم: تیرے اس دعوے کا ثبوت؟

سہراب: ثبوت اس بازو پر بندھی ہوئی میرے باپ رستم کی نشانی۔

رستم: جھوٹ ہے، غلط ہے۔ تو دھوکا دے رہا ہے۔ مجھے پاگل بنا کر اپنے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ (گھبراہٹ کے ساتھ سہراب کے بازو کا کپڑا اپھاڑ کر اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھتا ہے) وہی مہرہ، وہی نشانی! (سر پٹک کر) کیا کیا؟ کیا کیا؟ اندھے پاگل جلاد! یہ کیا کیا؟ شیر جیسا خونخوار، بھیڑیے جیسا ظالم، ریچھ جیسا موذی حیوان بھی اپنی اولاد کی جان نہیں لیتا۔ لیکن تو انسان ہو کر حیوان سے بھی زیادہ خونی اور جہنم سے بھی زیادہ بے رحم ہے.........

خون میں ڈوبا ہے وہ جس سے مزہ جینے میں تھا
دل کے بدلے کیا کوئی پتھر ترے سینے میں تھا
توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے او ظالم اسے
تیرا نقشہ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا

سہراب: فتح مند بوڑھے! تو رستم نہیں ہے پھر میری موت پر خوش ہونے کے بدلے اس طرح کیوں رنج کر رہا ہے؟

رستم: (رو کر) اس دنیا میں رنج اور آنسو، رونے اور چھاتی پیٹنے کے سوا میرے لیے اب اور کیا باقی رہ گیا ہے۔ میں نے تیری زندگی تباہ کر کے اپنی زندگی کا ہر عیش اور اپنی دنیا کی ہر خوشی تباہ کر دی۔ مجھ سے نفرت کر! میرے منہ پر تھوک دے! مجھ پر ہزاروں زبانوں سے

لعنت بھیج:

ع
فغاں ہوں، حسرت و ماتم ہوں، سر سے پاؤں تک غم ہوں
میں ہی بیٹے کا قاتل ہوں، میں ہی بد بخت رستم ہوں

(سہراب کے پاس ہی زمین پر گر پڑتا ہے اور سہراب اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چھاتی سے لپٹ جاتا ہے۔)

سہراب: بابا! میرے بابا!

رستم: ہائے میرے پیارے! تو نے الفت سے، نرمی سے، منت سے، کتنی مرتبہ میرا نام پوچھا۔ اس محبت و عاجزی کے ساتھ پوچھنے پر لوہے کے ٹکڑے میں بھی زبان پیدا ہو جاتی ہے، پتھر بھی جواب دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس دو روزہ دنیا کی جھوٹی شہرت اور اس فانی دنیا کے فانی غرور نے میرے ہونٹوں کو ہلنے کی اجازت نہ دی۔ میرے بچے! میری تہمینہ کی نشانی.........

ع
کس جگہ بے رحم سینے میں نہاں رکھوں تجھے
آنکھ میں، دل میں، کلیجے میں، کہاں رکھوں تجھے

سہراب: ہومان، بارمان، ہجیر سب نے مجھے دھوکا دیا۔ بابا نہ رو! میری موت کو خدا کی مرضی سمجھ کر صبر کر.........

ع
مل گئی مجھ کو جو قسمت میں سزا لکھی تھی
باپ کے ہاتھ سے بیٹے کی قضا لکھی تھی

رستم: جب تیری ناشاد ماں بال نوچتی، آنسو بہاتی، چھاتی پیٹتی، ماتم اور فریاد کی تصویر بنی ہوئی سامنے آکر کھڑی ہوگی اور پوچھے گی کہ میرا لاڈلا سہراب، میرا بچہ، میری کوکھ سے پیدا ہونے والا شیر کہاں ہے تو اپنا ذلیل منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لینے کے سوا اسے کیا جواب دوں گا؟ کن لفظوں سے اس کے ٹوٹے ہوئے دل اور زخمی کلیجے کو تسلی دوں گا.........؟

سنوں گا ہائے کیسے مامتا کی اس دہائی کو
کہاں سے لاؤں گا مانگے گی جب اپنی کمائی کو
نگاہیں کس طرح اٹھیں گی مجھ قسمت کے ہیٹے کی
دکھاؤں گا میں کن ہاتھوں سے ماں کو لاش بیٹے کی

سہراب: پیارے باپ! میری بدنصیب ماں سے کہنا کہ انسان سب سے لڑسکتا ہے، قسمت سے جنگ نہیں کرسکتا۔ آہ! (رستم کی گود سے زمین پر گر کر آنکھیں بند کرلیتا ہے۔)

رستم: یہ کیا! یہ کیا! میرے بچے آنکھیں کیوں بند کرلیں؟ کیا خفا ہو گئے؟ کیا ظالم باپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے؟ یہ موت کا گہوارہ، یہ خون میں ڈوبی ہوئی زمین، پھولوں کا بستر، ماں کی گود باپ کی چھاتی نہیں ہے، پھر تمھیں کس طرح نیند آگئی.........

سہراب: ماں.........خدا.........تمھیں.........تسلی دے!

رستم: اور.........اور.........بیٹا بولو.........بولو، چپ کیوں ہو گئے۔ آہ! آہ! اس کا خون سرد ہو رہا ہے۔ اس کی سانسیں ختم ہو رہی ہیں۔ اے خدا! اے کریم و رحیم خدا! اولاد باپ کی زندگانی کا سرمایہ اور ماں کی روح کی دولت ہے۔ یہ دولت محتاجوں سے نہ چھین۔ اپنی دنیا کا قانون بدل ڈال۔ اس کی موت مجھے اور میری باقی زندگی اسے بخش دے۔ موت! موت تو زال ورودابہ کے گھر کا اجالا اور بڑھاپے کی امید، میری تہمینہ کا بولتا کھیلتا ہوا کھلونا کہاں لے جا رہی ہے؟ دیکھ، میری طرف دیکھ! میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو تاج وتخت کی بھیک دی ہے۔ آج ایک فقیر کی طرح تجھ سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں.........

ڈال دے جھولی میں تو میرے گل شاداب کو
ہاتھ پھیلائے ہوں میں دے دے مرے سہراب کو

سہراب: (آنکھیں بند کیے ہوئے) دنیا.........رخصت.........خدا!
(مرجاتا ہے۔)

رستم: آہ! جوانی کا چراغ آخری ہچکی لے کر بجھ گیا۔ بے رحم موت نے میری امید کی روشنی لوٹ لی۔ اب لاکھوں چاند، ہزاروں سورج مل کر بھی میرے غم کا اندھیرا دور نہیں کرسکتے۔ آسمان، ماتم کر! زمین، چھاتی پیٹ! درختو، پہاڑو، ستارو، ٹکرا کر چور چور ہو جاؤ! آج ہی زندگی کی قیامت ہے۔ آج ہی دنیا کا آخری دن ہے۔ زندگی! دنیا! کہاں ہے زندگی؟ کہاں ہے دنیا؟ زندگی سہراب کے خون میں اور دنیا رستم کے آنسوؤں میں ڈوب گئی (دیوانوں کی طرح پکارتا ہے) سہراب.........سہراب.........سہراب.........(غش کھا کر گر پڑتا ہے)۔

(پردہ گرتا ہے)۔

سوالات

-1 مختصر جواب دیجیے:

-i رستم نے کیا دعا مانگی؟

-ii سہراب نے رستم کا کیا پیشکش کی؟

-iii سہراب نے مرتے وقت کسے یاد کیا؟

-iv رستم نے کب اور کیسے پہچانا کہ سہراب اس کا بیٹا ہے؟

-2 اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

-i اس کی .... کا خیال آتے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔

-ii ایک غیبی .... بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔

-iii .... کا پہیہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا۔

-iv افسوس تو نے میرے .... کی قدر نہ کی۔

-v تمھارے نصیب میں .... کا دیدار نہ تھا۔

فانی زندگی کے .... غرور نے میرے ہونٹوں کو ہلنے کی اجازت نہ دی۔

جوانی کا .... آخری ہچکی لے کر بجھ گیا۔

.... سہراب کے خون میں اور .... رستم کے آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

-3 سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"پروردگار! میں نے کبھی تیرے قہر وغضب کو حقیر نہیں سمجھا۔ کبھی تیری طاقت کے سامنے اپنی فانی طاقت کا غرور نہیں کیا۔ پھر اس ذلت کی شکل میں تو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ اے دردمندوں کی دوا اور کمزوروں کی طاقت! اے ناامیدوں کی امید! میں نے کل ساری رات تیرے حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر مدد کے لیے التجا کی ہے۔ اپنے عاجز بندے کی التجا قبول کر۔ اس بڑھاپے میں دنیا کے سامنے میری شرم رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور وجوش مجھے دوبارہ واپس دے دے۔"

-4 کم از کم تین اوصاف تحریر کریں جو ڈرامے کو افسانے اور کہانی سے ممتاز کرتے ہیں۔

(ولادت: ۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء)

میرزا ادیب

اصل نام دلاور علی ہے۔ میرزا ادیب نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے کیا اور پھر اردو ادب کی خدمت پر کمربستہ ہو گئے۔ ان کا خاص میدان افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری ہے۔ انھوں نے کئی رسالوں کی ادارت کے فرائض انجام دیے، ان میں ''ادب لطیف'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ میرزا ادیب نے رومانی داستانوں، افسانوں، ڈراموں اور غزل و نظم پر طبع آزمائی کی ہے۔ ''صحرانورد کے خطوط'' ان کا ابتدائی کارنامہ ہے جس میں رومانی فضا ملتی ہے۔ مضامین بھی لکھے ہیں مگر ان کی شہرت کا انحصار ان کے یک بابی ڈراموں پر ہے۔ جنھیں انھوں نے بڑی خوبصورتی اور فنکاری سے لکھا ہے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

آنسو اور ستارے، لہو اور قالین، ستون پس پردہ، خوابوں کے مسافر، شیشے کی دیوار، فصیل شب، خاک نشیں وغیرہ۔ مٹی کا دیا ان کی خودنوشت ہے۔ ان کے ڈراموں کی زبان صاف، سادہ اور شگفتہ ہے۔ فنی اعتبار سے ادیب کے ڈرامے ایک اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

جب اور اب

کردار: پہلی جھلک: صاحبِ کرسی۔ چپراسی۔ صاحبِ کرسی کے مدّاحین۔

دوسری جھلک: صاحب۔ چپراسی اور پی۔اے۔

منظر: ایک وسیع اور خوبصورت کمرا۔

مقام: کوئی بھی شہر۔

زمانہ: جب وہ کرسی نشین تھا۔

اس وسیع اور خُوبصورت کمرے کی سب سے نمایاں چیز وہ چمکتی دمکتی ہُوئی سُنہری پایوں والی بلند کرسی ہے جو کمرے کے درمیان سجی ہے اور جس پر "صاحبِ کرسی" رَونق اَفروز ہیں۔ "صاحبِ کرسی" شاندار شخصیت کے مالک ہیں۔ چہرے پر وجاہت اور عظمت کے آثار۔ اُن کے اردگرد کرسیوں پر ان کے مدّاحین بیٹھے ہیں۔

(پردہ اٹھتا ہے تو مدّاحین بڑے احترام کے ساتھ صاحبِ کرسی سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں)۔

پہلا مدّاح: (صاحبِ کرسی سے) وہ حضور! میں نے عرض کیا تھا۔

صاحبِ کرسی: بھُول گیا ہوں، معاف کیجیے۔ کیا ارشاد ہے؟

پہلا مدّاح: وہ حُضور! میں نے کہا تھا نا کہ پرچے کا خاص نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اُس کے لیے آپ کے پیغام کی اَشد ضرورت ہے۔

صاحبِ کرسی: خاص نمبر کے لیے خاص شخصیتوں کے پیغام لیجیے۔

پہلا مدّاح: آپ سے بڑھ کر بھی کوئی خاص شخصیت ہو سکتی ہے؟

(پہلا مدّاح اور صاحبِ کرسی ہنس پڑتے ہیں۔ باقی مدّاحین صرف مسکراتے ہیں۔)

صاحبِ کرسی: بہتر مل جائے گا پیغام آپ کو۔

دوسرا مدّاح: میری بات آپ بھُول گئے ہوں گے حضور!

صاحبِ کرسی: (ہنس کر) یہی سمجھ لیں۔

دوسرا مدّاح: جناب، میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے بارے میں جو کتاب لکھ رہا ہوں، وہ کم و بیش

مکمل ہوگئی ہے۔ آپ کے ذاتی حالات والا باب تشنہ ہے۔ ادھر توجہ فرما سکیں تو بے حد ممنون ہوں گا۔

صاحبِ کرسی: (مسرت انگیز حیرت سے) کتاب مکمل ہوگئی ہے۔

دُوسرا مداح: جی ہاں.........

صاحبِ کرسی: کمال کردیا ہے آپ نے۔ بڑے زوروں سے کام کرتے ہیں۔ مگر میں کیا اور میرے حالات کیا؟

دوسرا مداح: صاحب، انکساری سے کام نہ لیں۔ آپ کے اَن گنت عقیدت مند آپ کے حالات جاننے کے لیے بے تاب و بے قرار ہیں۔ میرا خیال ہے اس دور کے مقبول ترین مصنف آپ ہیں۔

چوتھا مدّاح: کمال کردیا ہے اُنھوں نے تو.......... ایک طرف اتنی بڑی سرکاری ملازمت کی بے پناہ مصروفیتیں اور دوسری طرف تصنیف و تالیف کا کام۔

پہلا مدّاح: "اک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی۔"

(صاحبِ کرسی سمیت سب ہُنس پڑتے ہیں۔)

دوسرا مدّاح: تو جناب، تھوڑا سا وقت دیجیے۔

صاحب کرسی: میں تو کہتا ہوں.......... رہنے دیجیے اس معاملے کو۔

دوسرا مداح: (بڑے جوش و خروش سے) یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ سب کچھ لکھ دیا اور ذاتی حالات نہیں لکھے۔

تیسرا مداح: (جیب سے پان کی ڈِبیا نکال کر، کھول کر صاحبِ کرسی کی طرف بڑھاتے ہوئے) واللہ! بات سولہ آنے درست ہے، لوگ معاف نہیں کریں گے۔ (دوسرے مداح کی طرف اشارہ کرکے) اِن کے خُوب لتّے لیں گے۔

صاحبِ کرسی: شکریہ! پان نہیں کھاتا۔ (دوسرے مداح سے) میری زندگی میں عشق وشق تو ہے نہیں۔

دوسرا مدّاح: گفتگو کیجیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اتنا بڑا مصنف اور کوئی اُس کے عشق میں مبتلا نہ ہو۔ ناممکن!

سارے مداح: (بیک وقت) ناممکن۔

صاحبِ کرسی: (دوسرے مداح سے) آپ میری کھال اُدھیڑ کر ہی دم لیں گے۔

دوسرا مداح: ڈرتا ہوں صاحب! آپ کے عقیدت مند کہیں میری کھال اُدھیڑ کر نہ رکھ دیں۔

تیسرا مداح: جناب! ان کی آرزو ضرور پُوری کر دیں اور اس خاکسار کو بھی کچھ کہنا ہے۔ خدا کے لیے اب اپنے عقیدت مندوں کو مایوس نہ کریں۔ ہاں کہہ دیں۔ اسی ہفتے آپ کے ساتھ شام منانے کا اہتمام ہو جائے۔

صاحبِ کرسی: آپ بار بار یہ بات کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔

تیسرا مداح: شرمندہ تو میں ہو رہا ہوں۔ لوگ میری جان کھائے جا رہے ہیں۔ اب ہمیں مایوس نہ کریں۔ آپ کے منہ سے صرف ہاں نکلنے کی ضرورت ہے، سب کچھ ہو جائے گا۔

صاحبِ کرسی: اصل مسئلہ مقالہ نگاروں کا ہے۔

تیسرا مداح: کسی بڑے مقالہ نگار کا نام لیجیے جو آپ پر مقالہ لکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

چوتھا مداح: بڑے سے بڑا مقالہ نگار اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتا ہے۔

سب کے سب: بالکل

صاحب کرسی: اچھا.......... آپ مجبور کرتے ہیں تو.......... کوئی بھی شام مقرر کر لیں۔ حاضر ہو جاؤں گا۔

تیسرا مداح: شکریہ! دل و جان سے شکریہ!

چوتھا مداح: (صاحبِ کرسی سے) وہ کیا کہتے ہیں۔ "گل پھینکے ہے اَوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی۔"

پانچواں مداح: "اے خانہ بر اندازِ چمن، کچھ تو ادھر بھی۔" اس بندہ حقیر کی درخواست مدّت سے فضا میں معلق ہے، کچھ تو فرمایئے حضور! ہم ہیں کہ درِ دولت پر دستک دے رہے ہیں اور آپ رہے ہیں خوابِ ناز میں۔

(سب ہنس پڑتے ہیں)

چوتھا مداح: جناب! ان کی لچھے دار باتیں بعد میں سنیے، پہلے میری عرض داشت پر ذرا غور کیجیے۔

پانچواں مداح: ہاں صاحب! ان کی رشہ دار عرض داشت پر ذرا غور فرمالیں۔

(سب ہنس پڑتے ہیں)

صاحب کرسی: فرمایے۔

چوتھا مداح: وہ صدارت کا معاملہ تھا، دِن قریب آرہا ہے، یاددہانی کرا چکا ہوں۔

صاحب کرسی: یاد ہے اور کہیے۔

چوتھا مداح: تشکّر ....

پانچواں مداح: اب تو بقول ان کے اپنی لچھے دار بات کہہ سکتا ہوں، تو حضور! وہ عرض جو مدت سے فضائے بے کراں میں معلق ہے، خدشہ ہے کہ کہیں سر کے بل نہ گر پڑے۔ تو بندہ پرور! ہماری تقریب میں مہمان خصوصی بن کر کرم فرمائی کیجیے۔

چوتھا مداح: ماشاءاللہ

تیسرا مداح: کیا انداز نکالے ہیں بات کرنے کے!

پانچواں مداح: صاحبو! اب ان پر منحصر ہے کہ ہماری عرض مان لیں۔

باقی تمام: مان لیجیے حضور!

صاحبِ کرسی: بہت اچھا شعر سنایا آپ نے۔

پانچواں مداح: تو حضور! اس کا انعام دیں اور عرض قبول فرمالیں۔

صاحب کرسی: جیسا حکم۔

(پانچواں مداح اُٹھ کر فرشی سلام کرتا ہے۔ صاحبِ کرسی کا پرائیویٹ سیکرٹری کمرے کے اندر آتا ہے۔ صاحبِ کرسی اُس سے مخاطب ہوتے ہیں۔)

صاحبِ کرسی: بھئی، مہمانوں کے لیے چائے وغیرہ.......... جلدی کرو۔

پرائیویٹ سیکرٹری: سر، مٹھائی یا بسکٹ؟

صاحبِ کرسی: مٹھائی منگوائیں۔

پرائیویٹ سیکرٹری: رائٹ سر۔

چوتھا مداح: میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں، بغیر اجازت کے۔ یہ ہماری اور ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس دور میں (صاحبِ کرسی کی طرف اشارہ کرکے) یہ زندہ ہیں۔ شائد اس وجہ سے تاریخِ ادب میں ہمارا نام بھی آجائے۔

تیسرا مداح: آنا چاہیے۔

پانچواں مداح: آئے گا۔ ضرور آئے گا۔

پہلا مداح: انشاءاللہ تعالیٰ!

(چپراسی ایک لفافہ لے کر آتا ہے۔ صاحبِ کرسی اسے کھولتے ہیں اور ان کے چہرے

کارنگ کسی قدر متغیّر ہو جاتا ہے)

دوسرا مداح: کیوں حضور! خیر تو ہے؟

پانچواں مداح: معاملہ کیا ہے جناب؟

صاحبِ کرسی: تبادلہ ہو گیا ہے۔

سب: (ایک دم) تبادلہ؟

(پردہ گرتا ہے)

دوسری جھلک

پردہ اُٹھتا ہے۔ صاحب کرسی ایسی کرسی پر بیٹھے ہیں جس میں نہ تو چمک دمک ہے اور نہ جس کے پائے سُنہری ہیں۔ صاحب کرسی جواب محض "صاحب" ہیں، ایک فائل دیکھ رہے ہیں۔ اُن کے اردگرد جتنی کرسیاں بچھی ہیں، سب کی سب خالی ہیں۔ صاحب گھنٹی بجاتے ہیں، چپراسی آتا ہے۔

چپراسی: صاحب جی!

صاحب: پی۔اے۔ کو بلاؤ۔

(چپراسی چلا جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو اس کے ساتھ صاحب کا پی۔اے بھی ہے)

صاحب: (پی۔اے سے) میں نے ایک فہرست دی تھی؟

پی۔اے: میرے پاس ہے سر، (جیب سے ایک کاغذ نکال کر اُسے پڑھتے ہوئے) ایک صاحب اپنے رسالے کے خاص نمبر کے لیے آپ کا پیغام چاہتے ہیں۔ ایک صاحب آپ پر کتاب تصنیف فرما رہے ہیں۔ انھیں آپ کے ذاتی حالات جاننے کے لیے آپ سے ملاقات کرنی ہے۔ ایک صاحب آپ کے ساتھ شام منانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے صدارت کے لیے کہا ہے اور ایک اور صاحب آپ کو مہمانِ خصوصی بنانے کے آرزومند ہیں۔

صاحب: فہرست تو مکمل ہے؟

پی۔اے: یس سر۔

صاحب: جو صاحب بھی آئیں، انھیں روکا نہ جائے۔

پی۔اے: بالکل نہیں روکا جائے گا سر، بالکل نہیں روکا جائے گا۔

صاحب: گیٹ کیپر سے کہ دیا ہے؟

پی۔اے: تاکید کر دی ہے۔

صاحب: تاکید آج کی ہے؟

پی۔اے: نو سر، جب آپ نے فہرست دی، اُسی دن کر دی تھی۔ کوئی صاحب آئیں گے تو میں خود اُنھیں لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

صاحب: بہتر (لہجے میں مایوسی) اچھا۔

چپراسی: چائے لاؤں جناب!

صاحب: ابھی نہیں، کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔

(صاحب اُٹھ کر مُلحقہ باتھ روم میں جاتے ہیں۔ پی۔اے اور چپراسی انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں اور جب دروازہ بند ہو جاتا ہے تو پی۔اے اور چپراسی دونوں مسکراتے ہیں)

پی۔اے: ہمارے صاحب بھی بڑے بھولے بھالے ہیں۔

چپراسی: ہر روز کن لوگوں کا انتظار کرتے ہیں؟

پی۔اے: ان لوگوں کا جو ان کے مداح تھے۔

چپراسی: کیا تھے۔

پی۔اے: جو اِن کے خوشامدی تھے۔ جو اِن کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ انھیں اس دور کا سب سے بڑا مصنف سمجھتے تھے۔

چپراسی: یہاں کیوں نہیں آتے؟ صاحب بار بار پوچھتے ہیں۔

پی۔اے: میاں تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے؟ ہمارے صاحب بڑے قیمتی آدمی ہیں۔ مگر بڑے دفتر میں وہ جس کرسی پر بیٹھتے تھے، وہ کرسی بہت قیمتی تھی۔ اُس کے پائے سُنہری تھے۔ اس کرسی کے بڑے اختیارات تھے۔ وہ کرسی راکھ کو سونا بنا سکتی تھی تو جو لوگ وہاں آتے تھے، انھیں اُس کرسی کی چمک دمک لے آتی تھی۔ سمجھتے تھے کہ اُس کرسی کی مدد سے وہ اپنی راکھ کو سونا بنا سکتے ہیں۔

چپراسی: اچھا!

پی۔اے: اَب یہ کرسی، نہ تو اس میں چمک دمک ہے اور نہ اس کے پائے سنہری ہیں۔اس بے چاری کے مختصر سے اختیارات ہیں۔ہمارے صاحب لاکھ قیمتی سہی، یہ کرسی قیمتی نہیں۔اِس لیے اِن کی اپنی قیمت بھی گر گئی ہے۔پی۔اے خاموش ہو جاتا ہے۔صاحب آتے ہیں)

صاحب: (پی۔اے سے) آپ ذرا نیچے جائیں۔

پی۔اے: گیٹ پر سر؟

صاحب: گیٹ کیپر نے کسی کو روک نہ لیا ہو۔

پی۔اے: رائٹ سر۔

صاحب: (چپراسی سے) چائے بناؤ۔

چپراسی: ایک چائے صاحب جی!

(صاحب اس کا کوئی جواب نہیں دیتے۔کرسی پر بیٹھنے لگتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- صاحب کرسی کی شخصیت کیسی ہے؟

ii- چپراسی کی جانب سے لفافہ ملنے پر صاحب کرسی کے کیا تاثرات تھے؟

iii- صاحب کرسی ہر روز کن لوگوں کا انتظار کرتے تھے؟

iv- صاحب کرسی کے مدّاح اسے کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟

2- ڈراما ''جب اور اب'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

3- درج ذیل الفاظ وتراکیب کے معنی بتائیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے:

رونق افروز، طرفہ تماشا، معلّق، عرض داشت، فضائے بیکراں، ملحقہ، مدّاح، وجاہت

4- اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- ان کے اردگرد کرسیوں پر ان کے.......... بیٹھے ہیں۔

ii- خاص نمبر کے لیے خاص شخصیتوں کے.......... لیجیے۔

iii- میرا خیال ہے اس دور کے مقبول ترین.......... آپ ہیں۔

iv- ایک طرفہ تماشا ہے.......... کی طبیعت بھی۔

v- ہماری تقریب میں مہمان خصوصی بن کر.......... کیجیے۔

vi- ہمارے صاحب لاکھ قیمتی سہی یہ.......... قیمتی نہیں۔

طنز و مزاح

سنجیدگی کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح بھی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے۔ زندگی کو متوازن رکھنے میں اس کا بڑا حصہ ہے۔ ہنسی مزاح میں سلیقہ، شائستگی، غور و فکر اور ذکاوت کا عنصر کارفرما ہو تو خالص مزاح ہے جیسے پطرس بخاری کا مزاح۔ اگر اس میں برہمی، مقصدیت اور جذبۂ افتخار ہو گا تو طنز بن جائے گا۔ یہ طنز معاشرتی یا اجتماعی مفاد کے لیے ہو تو گوارا ہوتا ہے۔ شخصی ہو جائے تو مذموم اور نامقبول ٹھہرے گا۔ مزاح میں زندگی کی ناہمواریوں پر ہمدردانہ نظر ڈالی جاتی ہے جب کہ طنز میں نفرت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مزاح نگار مزاح پیدا کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔

غالب کے خطوط میں مزاح کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ دیگر نمایاں طنز و مزاح نگاروں میں فرحت اللہ بیگ، شفیق الرحمن، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا، کرنل محمد خاں، محمد خالد اختر شامل ہیں۔

شاعری میں بھی طنز و مزاح کی متعدد اہم مثالیں موجود ہیں اس سلسلے میں اکبر الہ آبادی، ضمیر جعفری، نذیر شیخ اور سید محمد جعفری زیادہ مشہور ہیں۔

(۱۸۹۸ء - ۱۹۵۸ء)

احمد شاہ پطرس بخاری

احمد شاہ بخاری نام اور پطرس قلمی نام تھا۔ ۱۸۹۸ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک پشاور میں تعلیم پائی، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے علمی اعزاز کے ساتھ آنرز کیا۔ وطن واپسی پر آپ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادبیات کا استاد مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ نے محکمہ تعلیم کی ملازمت چھوڑ دی اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں ترقی کرتے کرتے ڈائریکٹر جنرل ہو گئے۔ جب پاکستان بنا تو دہلی سے لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ آپ کی قابلیت اور شخصیت کے پیش نظر حکومت پاکستان نے اپنا مستقل مندوب بنا کر اقوام متحدہ میں بھیج دیا۔

پطرس نے بہت کم لکھا ہے۔ ان کی شہرت کا انحصار ان کے چند مضامین پر ہے جو ''مضامینِ پطرس'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے مزاح نگاری کا نیا اسلوب تلاش کر کے مزاح نگاری کے میدان میں ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی ہے۔ مضامین کی زبان سادہ اور رواں ہے۔ اردو ادب میں خالص مزاح نگاری میں ان کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دوسروں پر ہنسنا آسان بات ہے مگر اپنے آپ پر دوسروں کو ہنسانے کے لیے حوصلہ چاہیے۔ پطرس نے ''صورتِ حال'' اور ''صورتِ واقعہ'' میں اپنے آپ کو پیش کر کے دوسروں کو ہنسانے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔ ان کے بارے میں نقادوں کا یہ قول ہے کہ ''انھوں نے اپنی ظرافت کا مواد زندوں سے لیا ہے۔''

مرحوم کی یاد میں

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب وغریب مشین پر نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا ''کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟''

نوکر بولا ''حضور یہ بائیسکل ہے۔''

میں نے کہا، ''بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟''

کہنے لگا، ''مرزا صاحب نے آپ کے لیے بھجوائی ہے''۔

میں نے کہا، اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھجوائی تھی وہ کہاں گئی؟''

کہنے لگا، ''یہی تو ہے۔''

میں نے کہا، کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی، وہ بائیسکل یہی ہے؟''

کہنے لگا، ''جی ہاں''۔

میں نے کہا، ''اچھا'' اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

''اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟''

''حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے؟''

''تو یہ میلی کیوں ہے؟''

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

''اور تیل لایا؟''

''ہاں حضور لایا ہوں۔''

''دیا؟''

''نہیں''

''کیا وجہ؟''

''حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔''

''حضور دھروں پہ میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دبا گئے ہیں۔''

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ اتنا تو ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا، حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر، اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے، اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے، "چیں، چاں، چوں" کی قسم کی آوازیں تو زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ "کھٹ، کھڑ، کھڑڑ، کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں، "چر چرخ، چر چرخ" کی قسم کے سر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا، زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑا کر بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیا گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا، یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر نشان پڑتا جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی، لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا، جس کی وجہ سے پہیا ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور سر یوں پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیوں کو ملا کر "چوں چوں پھٹ، چوں چوں پھٹ" کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر سائیکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا اور بائیسکل کے کئی پرزے جو اب تک سو رہے تھے، بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے، ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی لیکن چونکہ اب بائیسکل پہلے سے تیز تھی،

اس لیے "چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ" کی آواز نے اب "چچوں پھٹ" "چچوں پھٹ" کی صورت اختیار کرلی۔ تمام بائیسکل کسی اَدَق افریقی زبان کی گردانیں دہرارہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبعِ نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا، لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعۃً چھے انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ پیڈل چلانے کے لیے ٹانگیں اوپر نیچے کرتا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہوکر باہر نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھارہا تھا۔

گدی کا نیچا ہوجانا ازحد تکلیف دہ ثابت ہوا، اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کرلوں، چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرالیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے سٹیشن سے نکل کر باہر آگیا ہوں۔ جیب سے میں نے اوزار نکالا، گدی کو اونچا کیا، ہینڈل کو کچھ ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہوگیا۔

دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہوگیا، اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا، جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کا تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دور سے میں ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا، جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لیے میری حالت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔ ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی نیچی ہوگئی اور میں ہمہ تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا: "دیکھو یہ آدمی کیا کررہا ہے؟" گویا اس بدتمیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہوجاتا وہ لمحے جن کے دوران میں، میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہوکر نہ بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا، لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہوجاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقررہ باقاعدگی اختیار کر لی تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔ بائیسکل کی کھڑ کھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے، سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا: ''ذرا اس کی مرمت کر دیجیے۔''

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی، جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھونک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے، لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا: ''کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟''

میں نے کہا: ''بڑے گستاخ ہو تم! دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا! ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور کتنے پیسے ہوئے؟''

مستری کہنے لگا: ''مڈگارڈ بھی ٹھیک کر دوں؟''

میں نے کہا: ''ہاں وہ بھی ٹھیک کر دو۔''

کہنے لگا: ''اگر آپ باقی چیزوں بھی ٹھیک کروا لیں تو اچھا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا کر دو۔''

بولا: یوں تھوڑی ہو سکتا ہے، دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جایئے۔''

''اور پیسے کتنے لو گے؟''

کہنے لگا: ''بس تیس چالیس روپے لیں گے۔'' میں نے کہا ''بس جی جو کام تم سے کہا ہے، کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔''

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا: ''میں نے کس تو دیا ہے، لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔''

میں نے کہا: ''ہیں! بدتمیز کہیں کا! تو دو آنے مفت میں لے لیے؟ بولا: ''جناب! آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی! یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ لو! یہ وہی بائیسکل ہے، جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں گزر گئیں اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔''

میں نے کہا: ”واہ! مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔“ مستری نے کہا: ”ہاں وہ ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب جب خود کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی۔“

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے، اس لیے ٹانگوں، کندھوں، کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا جو برداشت کے قابل نہ تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے، بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا، جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو، اس پر صبر و شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ ہی سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دکان آئی، وہاں ٹھہر گیا۔ دکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ ”یہ بائیسکل ہے۔“ دکان دار کہنے لگا: ”پھر!“

میں نے کہا: ”لو گے؟“

کہنے لگا: ”کیا مطلب؟“

میں نے کہا: بیچتے ہیں ہم۔“

دکان دار نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا، جیسے مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا، پھر مجھے دیکھا، پھر بائیسکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا: ”کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟“

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا: کہ تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے، انؔ کا مصرف کیا ہوگا؟“

کہنے لگا: ''وہ ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا؟''

میں نے کہا: ''اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا!''

کہنے لگا: اچھا! چڑھ گیا، پھر.............؟''

میں نے کہا: ''پھر کیا؟'' پھر چلائے گا اور کیا؟''

دکان دار بولا: ''اچھا۔ ہوں ''خدا بخش، ذرا یہاں آنا، یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔''

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا، انھوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا، جیسے بُو سونگھ رہے ہوں۔ اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ، جن کا نام خدا بخش تھا میرے پاس آئے اور کہنے لگے: ''آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں؟''

میں نے کہا: ''تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے بہانہ کر کے لایا تھا؟''

کہنے لگا: ''تو کیا لیں گے آپ؟''

میں نے کہا: ''تم ہی بتاؤ؟''

کہنے لگا: ''سچ مچ بتاؤں؟''

میں نے کہا: ''ہاں''

پھر کہنے لگا: ''سچ مچ بتاؤں؟''

میں نے کہا: ''ہاں''

پھر کہنے لگا: ''سچ مچ بتاؤں؟''

میں نے کہا: ''اب بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ترساتے رہو گے؟''

کہنے لگا: ''تین روپے دوں گا اس کے۔''

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ، پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا: مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بے ہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔'' یہ کہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا اور ادھر ادھر کی

عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جب حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے اس بات کا شوق تھا، جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے، جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی، جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت وشنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیا بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا اور باقی بائیسکل میرے پاس پڑی رہی۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو یہاں الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطرابی حرکت تھی، ورنہ وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔ جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا: ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟''

سب سوالوں کا یہی جواب ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو اور جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں، ہنسنے دو۔ اس قسم کے بے ہودہ لوگ ہر قوم اور ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا؟ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو، چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی: بس ''حضرت! غصہ تھوک ڈالیے۔'' ایک دوسرے صاحب بولے: ''بے حیا بائیسکل! گھر پہنچ کے تجھے مزہ چکھاؤں گا۔'' ایک والد اپنے لختِ جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: ''دیکھا بیٹا! یہ سرکس کی بائیسکل ہے اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔''

لیکن میں چلتا گیا تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں عزیمت پائی جاتی تھی۔ میں چلتا گیا، حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا، جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے، اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

(پطرس کے مضامین)

سوالات

1- مختصر جواب دیں:

i- بائیسکل بہت پرانی تھی۔اس وصف کوظاہر کرنے کے لیے مصنف نے کیا انداز اختیار کیا ہے؟

ii- بائیسکل کی گدی، مڈگارڈوں، زنجیراور پیڈلوں سے کس قسم کی آوازیں نکلتی تھیں؟

iii- اترائی پر جب سائیکل ذرا تیز ہوتی تو پہیوں کی آوازوں نے اردگرد کے ماحول پر کیسا اثر ڈالا؟

iv- جب سائیکل سوار پیچ کسوانے کے لیے مستری کی دکان پر گیا توان دونوں میں کیا گفتگو ہوئی؟

2- اس سبق کا خلاصہ لکھیے۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیے اورانھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

ضیافت طبع، مخمور، ادق، مجمل ہیئت، تامل، مصرف، عزیمت

4- سیاق سباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

''مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے، بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا۔جس میں مرزا کی مکاری، بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا کل بنی نوع انسانی اور آئندہ آنے والی نسلوں کی ناپاک فطرت سے آگاہ کردیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔''

5- درج ذیل بیانات پرانی بائیسکل کی کن خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟

i- پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مُرغا اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو۔

ii- ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔

iii- ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔

iv- تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

(۱۹۲۷ء - ۱۹۷۸ء)

ابن انشا

ابن انشا کا اصلی نام شیر محمد تھا۔ مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کی تحصیل پھلور کے ایک گاؤں "تھلہ" میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ ملازمت کی ابتدا ملٹری اکاؤنٹس میں ایک معمولی اسامی سے کی۔ لیکن پرائیویٹ طور پر تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۶ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔

ابن انشا نے ایک مصروف اور بھرپور ادبی زندگی گزاری ہے۔ ان کے شاعری کے مجموعوں میں "چاند نگر"، "اس بستی کے ایک کوچے میں" اور "دلِ وحشی" شامل ہیں۔ شاعری کے علاوہ کالم نگاری بھی کی۔ سفرنامے بھی لکھے۔ ان کے سفرناموں میں "چلتے ہو تو چین کو چلیے"، "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" خاصی مقبولیت اور شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی حس مزاح سے بھرپور شگفتہ اور رواں دواں نثر ہے۔ جس نے ان کی صحافیانہ تحریروں کو بلند پایہ ادبی مرتبہ اور زندۂ جاوید شان عطا کر دی ہے۔ ان کی اہم مزاحیہ تصانیف میں "اردو کی آخری کتاب"۔ "خمار گندم"۔ آوارہ گرد کی ڈائری" اور دنیا گول ہے" شامل ہیں۔ اپنے اسلوب تحریر کی رنگینی و رعنائی موضوعات کی رنگارنگی اور تنوع اور وسیع تر مشاہدہ کی وجہ سے اردو مزاح نگاری میں ایک منفرد اور ممتاز مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔

ابتدائی سائنس

مادّے کی قسمیں:

مادّے کی تین قسمیں ہیں۔ ٹھوس، مائع، گیس۔

ٹھوس کا مطلب ہے ٹھوس۔ جیسے ٹھوس دلائل۔ ٹھوس اقدامات۔ ٹھوس نتائج وغیرہ۔

ٹھوس دلائل ایسے دعوؤں کے لیے لائے جاتے ہیں جو خود کمزور ہوں۔ سب سے ٹھوس دلیل اب تک لاٹھی ہی ثابت ہوئی ہے۔ بھینسوں کے لیے بھی انسانوں کے لیے بھی۔

ٹھوس اقدامات اتنے ٹھوس ہوتے ہیں کہ کبھی نہیں کیے جاتے۔ بس حکومتیں ان کے ٹھوس وعدے کیا کرتی ہیں۔ ٹھوس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی حکومتیں بہت دن نہیں رہتیں۔

ٹھوس اشیا اپنی شکل نہیں بدلتیں۔ ہاں دوسروں کی بدل دیتی ہیں۔ پتھر ٹھوس ہے جیسا ہے ویسا ہی رہتا ہے لیکن کسی آدمی کے لگے تو وہ کیا ہی ٹھوس ہو۔ اس میں سے مائع اور گیس وغیرہ نکلنے لگتے ہیں۔ مایع جیسے آنسو گیس، جیسے آہیں، گالیاں وغیرہ۔

مایع:

مایع کا مطلب آپ جانتے ہی ہیں۔ لہٰذا تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، پانی بھی مایع ہے، دودھ بھی مایع ہے۔ اسی لیے مثل مشہور ہے۔ مایع کو مایع ملے کر کر لمبے ہاتھ۔ بعض اوقات مایع کو مایع میں ملانے کا نتیجہ بڑا ٹھوس نکلتا ہے۔ چنانچہ بعض گوالوں نے اسی فارمولے پر عمل کر کے بڑے بڑے مکان کھڑے کر لیے ہیں۔

یہ قول بھی دودھ والوں پر ہی صادق آتا ہے۔ مایع تیرے تین نام: پرسا، پرسُو، پرس رام۔

گیس:

گیس کا مطلب بھی ہمارے عزیز طالب علموں سے مخفی نہ ہوگا جسے دیکھو اس کی شکایت لیے پھرتا ہے۔ یہاں ہم اس کے لیے ایک آزمودہ نسخہ درج کرتے ہیں۔

اجوائن، کالا نمک، کلونجی اور اطریفل ہم وزن لیجیے اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پھانک لیجیے۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ سوڈا واٹر بھی مفید ہے۔

گرمیاں آتی ہیں تو محکمہ واٹر سپلائی پانی کے نلکوں میں گیس سپلائی کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے لوگ غسل خانوں میں روٹی پکاتے اور باورچی خانوں میں پسینا میں نہاتے دیکھے جاتے ہیں۔

حرارت:

حرارت کا مطلب ہے گرمی۔ گرمی کا لفظ آسان ہے۔ اسے استعمال کریں تو خطرہ ہے کہ طالب علموں کی سمجھ میں آجائے اور تعلیم کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اصطلاحیں مشکل ہی اچھی لگتی ہیں۔ انگریزی ذریعہ تعلیم کو بدلنے میں بھی ہچکچاہٹ اور تاخیر اسی وجہ سے ہے۔

حرارت ناپنے کا آلہ تھرمامیٹر کہلاتا ہے۔ جوں جوں حرارت بڑھے گی اس کا پارا چڑھتا جائے گا۔ آدمی بھی اسی اصول پر کام کرتا ہے۔ پیسے والے غریبوں کے مطالبات سنتے ہیں۔ گرمی کھاتے ہیں اور ان کا پارا چڑھ جاتا ہے۔ حرارت سے چیزیں پھیلتی ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک آپ بھی جانتے ہوں گے کہ جب تک کسی کی مٹھی گرم نہ کی جائے کام نہیں کرتا۔

کشش کا اُصول:

کشش کئی طرح کی ہوتی ہے۔ پیسے کی کشش۔ کرسی کی کشش۔ وغیرہ دنیا کے سارے کاروبار اور قوم کی بے لوث خدمتیں پہلی دو کششوں کے باعث ہیں۔

کششِ ثقل

یہ نیوٹن نے دریافت کی تھی۔ غالباً اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ نیوٹن اس سے درختوں سے سیب گرایا کرتا تھا۔ آج کل سیڑھی پر چڑھ کر توڑ لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی شخص حکومت کی کرسی پر بیٹھ جائے تو اس کے لیے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ زبردستی اٹھاتے ہیں۔ یہ بھی کشش ثقل کے باعث ہے۔

کشش انابیت شعری:

انابیت انب کی جمع ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہمیں نہیں آتے۔ کشش کا مطلب کشش۔ شعر کا مطلب شعری۔

یہ شاید اس کشش کا نام ہے جس کے بل پر لوگ مشاعروں میں کھنچے آتے ہیں۔ لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

پانی:

پانی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ بارش کا پانی، نل کا پانی، کوکا کولا کا پانی، گرائپ واٹر، سیون اپ، چلّو بھر پانی وغیرہ۔

پانی بڑے کام کی چیز ہے لیکن اس میں ایک خرابی ہے۔ یہ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ جب ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے تب بھی ہمیں اس پر یہی اعتراض تھا اس کی دیکھا دیکھی لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ انسانوں کو بھی اپنی سطح ہموار رکھنی چاہیے۔ یہ غلط بات ہے۔ پانی پانی ہے۔ انسان انسان ہے۔ ہمارے سائنس دان آج کل بڑے بڑے دستخطوں سے لمبے لمبے بیان نکال رہے ہیں تا کہ یہ رجحان نہ پھیلے۔ انھیں چاہیے کہ پانی کو سمجھائیں کہ میاں تو بھی اپنی سطح اونچی نیچی رکھا کر۔ اُونچ نیچ میں بڑے فائدے ہیں۔ سطح ہموار رکھنے سے کیا حاصل۔ کچھ عاقبت کی بھی فکر ہے تجھے!

روشنی:

روشنی بڑی اچھی چیز ہے۔ سوائے روشنی طبع کے جو بلا بھی ہو جاتی ہے۔ روشنی پیدا کرنے کے کئی ذرائع ہیں۔ موم بتی۔ بلب۔ لالٹین۔ سورج روشنی تو خوب دیتا ہے۔ لیکن دن میں اس کا نکلنا بے فائدہ ہے۔ دن میں تو ویسے بھی روشنی ہوتی ہے۔ رات کو نکلا کرتا تو اچھا تھا۔

روشنی کا ایک مصرف یہ ہے کہ اس پر پروانے آتے ہیں اور پروانہ وار نثار ہوتے ہیں۔

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ اندھیرے کی رفتار کبھی ناپی نہیں گئی۔ اس سے کچھ زیادہ سمجھیے۔ اندھیرے کو ظلمات بھی کہتے ہیں۔ بحر ظلمات ایک سمندر ہے جس سے علامہ اقبالؒ کے بیان کے مطابق پرانے زمانے کے مسلمان ریس کورس کا کام لیا کرتے تھے۔ یعنی ان میں گھوڑے دوڑائے جاتے تھے۔

(اردو کی آخری کتاب)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- مادے کی کتنی قسمیں ہیں؟

ii- مایع کسے کہتے ہیں؟

iii- گیس ختم کرنے کے لیے آزمودہ نسخہ کیا ہے؟

iv- حرارت کی تعریف کیجیے۔

v- پانی کتنی طرح کا ہوتا ہے۔

2- خالی جگہ پُر کریں:

i- ٹھوس کا مطلب ہے......۔

ii- مایع جیسے آنسو گیس جیسے......۔

iii- لوگ باورچی خانوں میں...... دیکھے جاتے ہیں۔

iv- کشش ثقل...... نے دریافت کی تھی۔

v- پانی بڑے...... ہے۔

3- درج ذیل طنزیہ اور مزاحیہ بیانات میں کن سنجیدہ باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

i- بحرِ ظلمات ایک سمندر ہے جس سے علامہ اقبالؒ کے بیان کے مطابق پرانے زمانے کے مسلمان ریس کورس کا کام لیا کرتے تھے۔

ii- بعض اوقات مایع کو مایع میں ملانے کا نتیجہ بڑا ٹھوس نکلتا ہے۔

iii- انسانوں کو بھی اپنی سطح ہموار رکھنی چاہیے۔ یہ غلط بات ہے۔ پانی، پانی ہے اور انسان، انسان۔

vi- روشنی بڑی اچھی چیز ہے سوائے روشنی طبع کے جو بلا بھی ہو جاتی ہے۔

v- کشش کئی طرح کی ہوتی ہے۔ پیسے کی کشش، کرسی کی کشش وغیرہ۔ دنیا کے سارے کاروبار اور قوم کی بے لوث خدمتیں مذکورہ دو کششوں کے باعث ہیں۔

4- ''اُردو کی آخری کتاب'' اس عنوان سے اُردو کے ایک مشہور مزاح نگار نے ایک مضمون بھی تحریر کیا ہے۔ ان کا نام اپنے استاد سے پوچھ کر ڈائری میں لکھیے۔

(۱۹۲۰ء - ۱۹۹۹ء)

شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن ڈاکٹر تھے۔ فوج سے وابستہ رہے اور مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ آپ ان مزاح نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے بھرتی کی ایک چیز بھی نہیں لکھی۔ آپ کی تحریر میں بڑی شوخی اور تازگی ہے۔

آپ بڑی پیاری زبان لکھتے ہیں اور آپ کے الفاظ کا چناؤ بڑا ہی دلکش ہوتا ہے۔ شفیق الرحمٰن محض مزاح نگار ہی نہیں، وہ زندگی کے المیہ سے اتنے قریب ہیں جتنے اس کے طربیہ پہلو سے۔ آپ کی تصانیف میں ''کرنیں''، ''شگوفے''، ''لہریں''، ''مدوجزر''، ''پرواز''، ''حماقتیں''، ''پچھتاوے''، ''مزید حماقتیں''، ''انسانی تماشا''، ''دجلہ'' اور ''دریچے'' شامل ہیں۔

شفیق الرحمٰن کی تحریر میں طنز، خالص مزاح اور ظرافت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ لفظ اور خیال دونوں کی مدد سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مزاح کا پہلو غالب ہے۔ اگر کہیں طنز ہے بھی تو اس میں دل آزاری کا کوئی پہلو موجود نہیں ہوتا۔ یہی فقروں کی چستی اور بندش کے سبب ان کی تحریر میں شگوفہ طرازی کا دل آویز حسن پایا جاتا ہے۔

کلیدِ کامیابی

ہم لوگ خوش قسمت ہیں کیونکہ ایک حیرت انگیز دور سے گزر رہے ہیں۔ آج تک انسان کو ترقی کرنے کے اتنے موقعے کبھی میسر نہیں ہوئے۔ پرانے زمانے میں ہر ہنر خود سیکھنا پڑتا تھا لیکن آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد پر خواہ مخواہ تلا ہوا ہے اور بلا وجہ دوسروں کو شاہراہ کامیابی پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ اگر آپ کی مالی حالت مخدوش ہے تو فوراً "لاکھوں کماؤ" خرید لیجیے۔ اگر مقدمہ بازی میں مشغول ہیں تو "رہنمائے قانون" لے آیئے۔ اگر بیمار ہیں تو "گھر کا طبیب" پڑھنے سے شفا یقینی ہے۔ اسی طرح کامیاب زندگی، کامیاب مرغی خانہ، ریڈیو کی کتابیں، کلید کامیابی، کلید مویشیاں اور دوسری لاتعداد کتابیں بنی نوع انسان کی جو خدمت کر رہی ہیں اس سے ہم واقف ہیں۔

مصنف ان کتابوں سے اس قدر متاثر ہوا ہے کہ اس نے از راہ تشکر کلید کامیابی حصہ دوم لکھنے کا ارادہ کیا۔ تاکہ وہ چند نکتے جو اس افادی ادب میں پہلے شامل نہ ہو سکے اب شریک کر لیے جائیں۔

تربیتِ اطفال:

بچوں سے کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آیئے۔

بچے سوال پوچھیں تو جواب دیجیے مگر اس انداز میں کہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں۔ اگر زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجیے جب بڑے ہو گے سب پتہ چل جائے گا۔ بچوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیے۔ شاید وہ بزرگوں کا ادب کرنے لگیں۔ بچوں کو دلچسپ کتابیں مت پڑھنے دیجیے۔ کیونکہ کورس کی کتابیں کافی ہیں۔

اگر بچے بے وقوف ہیں تو پروا نہ کیجیے۔ بڑے ہو کر یا تو جینیئس بنیں گے یا اپنے آپ کو جینیئس سمجھنے لگیں گے۔ بچے کو سب کے سامنے کبھی مت ڈانٹیے۔ اس سے تحت الشعور پر برا اثر پڑے گا۔ ایک طرف لے جا کر تنہائی میں اس کی خوب تواضع کیجیے۔

بچوں کو پالتے وقت احتیاط کیجیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں۔ ورنہ وہ بہت موٹے

ہو جائیں گے اور والدین اور پبلک کے لیے خطرے کا باعث ہوں گے۔

اگر بچے ضد کرتے ہیں تو آپ بھی ضد کرنی شروع کر دیجیے۔ وہ شرمندہ ہو جائیں گے۔

ماہرین کا اصرار ہے کہ موزوں تربیت کیلئے بچوں کا تجزیہ نفسی کرانا ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے والدین اور ماہرین کا تجزیہ نفسی کرالینا زیادہ مناسب ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ کنبے میں صرف دو تین بچے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیے جاتے ہیں۔ لہذا بچے دس بارہ ہونے چاہئیں۔ تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔

اسی طرح آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہیے۔

دوسروں کو متاثر کرنا:

کبھی مت کہیے کہ۔۔۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، بلکہ اس سے پوچھیے کہ کہیں وہ تو آپ سے مل کر خوش نہیں ہو رہا۔ اگر یہ بات ہے تو خبردار رہیئے۔

گفتگو کا آرٹ:

جو کچھ کہنے کا ارادہ ہو ضرور کہیے۔ دوران گفتگو خاموش رہنے کی صرف ایک وجہ ہونی چاہیئے، وہ یہ کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ ورنہ جتنی دیر جی چاہے باتیں کیجئے۔ اگر کسی اور نے بولنا شروع کر دیا تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور کوئی دوسرا آپ کو بور کرنے لگے گا (بور وہ شخص ہے جو اس وقت بولتا چلا جائے جب آپ بولنا چاہتے ہوں)۔

چنانچہ جب بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکیں تو ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیں کہ! ابھی بات ختم نہیں ہوئی یا قطع کلامی معاف کہہ کر پھر سے شروع کر دیجیے۔ اگر دوسرا اپنی طویل گفتگو ختم نہیں کر رہا تو بے شک جمائیاں لیجیے۔ کھانسیے۔ بار بار گھڑی دیکھیے۔۔۔ ''ابھی آیا''۔۔۔ کہہ کر باہر چلے جائیے، یا وہیں سو جائیے۔

یہ بالکل غلط ہے کہ آپ لگاتار بول کر بحث نہیں جیت سکتے۔ اگر آپ ہار گئے تو مخالف کو آپ کی ذہانت پر شبہ ہو جائے گا۔ مجلسی تکلفات بہتر ہیں یا اپنی ذہانت پر شبہ کروانا؟

البتہ لڑیے مت اس سے بحث میں خلل آ سکتا ہے۔

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے کبھی مت مانیے۔ لوگ ٹوکیں تو الٹے سیدھے دلائل بلند آواز میں پیش کر کے انہیں خاموش کرا دیجیے ورنہ خواہ مخواہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ دوران گفتگو میں لفظ ''آپ'' کا استعمال دو تین مرتبہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ اصل چیز ''میں'' ہے۔ اگر آپ نے اپنے متعلق نہ کہا تو دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے۔

تعریفی جملوں کے استعمال سے پرہیز کیجیے۔ کبھی کسی کی تعریف مت کیجیے۔ ورنہ سننے والے کو شبہ ہو جائے گا کہ آپ اسے کسی کام کے لئے کہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی شخص سے کچھ پوچھنا مطلوب ہو جسے وہ چھپا رہا ہو تو اس کی بات کاٹ کر اسے چڑا دیجیے۔ وکیل اسی طرح مقدمے جیتتے ہیں۔

دلیر بننے کا طریقہ:

دوسرے تیسرے روز چڑیا گھر جا کر شیر اور دیگر جانوروں سے جا کر آنکھیں ملائیے۔ لیکن پنجرے کے زیادہ قریب مت جائیے۔ بندوق خرید کر انگیٹھی پر رکھ لیجیے اور لوگوں کو سنائیے کہ کس طرح آپ نے پچھلے مہینے ایک چیتا یا ریچھ (یا دونوں) مارے تھے۔ بار بار سنا کر آپ خود یقین کرنے لگیں گے کہ واقعی آپ نے کچھ مارا تھا۔

(مزید حماقتیں)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- مصنف نے تربیت اطفال میں کن اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے؟

ii- دوسروں کو متاثر کرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

iii- "گفتگو کا آرٹ" میں ہماری مجلسی زندگی کی کن خامیوں کی نشان دہی کی گئی ہے؟

2- مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے اور جملوں میں استعمال کیجیے:

مخدوش، تحت الشعور، تجزیہ نفسی، پیچیدہ، تھکا ماندہ، پریشان کن، پھبتیاں، ازراہ تشکر، گامزن، ماہرین

3- اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- ہم لوگ خوش قسمت ہیں کیونکہ ایک .... دور سے گزر رہے ہیں۔

ii- بچوں سے کبھی کبھی .... سے بھی پیش آیئے۔

iii- بچوں کو پالتے وقت احتیاط کیجیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ .... جائیں۔

iv- کوئی .... سرزد ہو جائے تو اسے کبھی مت مانیے۔

v- .... جملوں کے استعمال سے پرہیز کیجیے۔

4- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

کوئی غلطی سرزد ہو جائے .... تو دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے۔

(ولادت: ۱۹۲۳ء)

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ وہ راجستھان (بھارت) کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست 'ٹونک' کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے مسلم کمرشل بنک کے منیجر کے طور پر اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور پھر ترقی کر کے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔

مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف میں چراغ تلے، زرگزشت، خاکم بدہن اور آب گم کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ''خاکم بدہن'' پر انھیں آدم جی ادبی انعام بھی ملا ہے۔ ان کے اسلوب تحریر کا ایک بڑا وصف زبان و بیان کی دلکشی ہے۔ زندگی کی سادہ اور عام اشیا میں مضحک پہلو تلاش کر کے عمدہ اور چونکا دینے والے اسلوب میں بیان کرنے میں، انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کی تحریر میں شگفتگی، روانی، شعریت اور مطالعہ باہم شیر و شکر ہیں۔ شائستہ شگفتگی اور شگفتہ شائستگی سے کتنی ہی تلخ حقیقتوں کو گوارا بنا دیتے ہیں۔

پڑیے گر بیمار

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیماردار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مر جایے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ توبہ کیجیے! مرنے کا یہ اُکل کھرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ ہوسکتا ہے غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے۔ اسی بنا پر غالب کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷۷ھ میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اس میں ان کی کسرِ شان تھی حالانکہ اپنی پیشین گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزومند تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ بھی نہیں۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ورنہ سرِ دست مجھے اُن خوش نصیب جواں مرگوں سے سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف ہیں۔ میرا تعلق تو اس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقولِ شاعر ؏

جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

چنانچہ اس وقت میں اس بے زبان طبقے کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں جو اس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے جو موت اور زندگی دونوں سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے — یعنی بیماری! میرا اشارہ اس طبقے کی طرف ہے جسے ؏

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحت کے سوا

میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمۂ علالت ہے۔ اسپرین کی صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس روحانی اذیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائم المرض کی حیثیت سے جو اس دردِلا دوا کی لذت سے آشنا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پُرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔

اُردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی غایت

"تقریب بہر ملاقات" کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب، عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا تھا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی اُمید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پرسی کو آ نکلے۔ ع

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اُس زمانے کے انداز عیادت میں کوئی دل نوازی ہو تو ہوئیں تو اُن لوگوں میں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔ ایک حساس دائم المرض کے لیے "مزاج اچھا ہے؟" ایک رسمی یا دعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اُسے احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ میں تو آئے دن کی پرسش حال سے اس قدر بے زار ہو چکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کر دیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اطلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں، مجھے حسبِ معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پرسی کر کے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

سُنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے۔ شائستگی کا یہ سخت معیار صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے ملک میں سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔ یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے کہہ دیجیے کہ مجھے زکام ہو گیا ہے۔ پھر دیکھیے، کیسے کیسے مجرب نسخے، خاندانی چٹکلے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی اصل وجہ طبی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاقِ سلیم کی کمی۔ بہرحال، بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرست آدمی اپنا خوش گوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فی صد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آرزدہ ہوتے ہیں کہ میں اُن کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا حالانکہ اُن پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔ اس وقت میرا منشا صلاح مشورے کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔ اسی سے ذہنی توازن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ مقصود ہے۔ مُدّعا صرف اپنے اُن بہی خواہوں کو متعارف کرانا ہے جو میرے مُزمن امراض کے اسباب و عِلَل پر غور کرتے اور اپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں۔ اگر اس غول میں آپ کو کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجیے، آپ خود لائق ہمدردی ہیں۔

سرفہرست ان مزاج پرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض تشخیص کرتے ہیں نہ دوا تجویز کرتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکسر مزاج ہیں۔ دراصل ان کا تعلق اس مدرسۂ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ یہ اس شکم آزار عقیدے کے مبلغ و موید ہیں کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا، صحت کے لیے اتنا ہی مفید ہوگا۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دواؤں کے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے۔ طب قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفّی خون تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدحے اسی اُمید میں نوش جان کیے جاتے ہیں۔

اس قبیل کے ہمدردانِ صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوہانجنی نکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹتے ہی بولے:

"فم معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مُونگ کی دال کھایئے۔ دافع نفخ و محلل ورم ہے۔"

میں نے پوچھا آخر "آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟ فرمایا "کیا مطلب؟

عرض کیا "دو چار دن مونگ کی دال کھا لیتا ہوں تو اُردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟

بولے "آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی۔"

گزارش کی "اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی!"

بات انھیں بُری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ استعارہ و کنایہ برطرف، میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے، اُسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی

مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھیے تو عمدہ غذا کے بعد کم از کم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کے ہر راہ گیر کو سینے سے لگا لوں۔

دوسرا گروہ قوت ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجے سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دُعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت اُن سترے بہترے بزرگوں کی ہے جو گھگیا گھگیا کر اپنی درازیِ عمر کی دعا مانگتے ہیں اور اسی کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس روحانی غذا کے لیے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرۂ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دورانِ علالت میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گرجتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکے، کپکپا کر کہنے لگے:

"بیماری آزاری میں بھی بڑی غیریت برتتے ہیں؟ برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔"

بہتیرا جی چاہا کہ اس دفعہ اُن سے پوچھ ہی لوں کہ "قبلۂ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کرا دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟"

ان کی زبان اس قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ ہے اور کاٹتی کم۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے جیسے کوئی گودن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کر رہا ہو۔ مجھے اُن کی ڈانٹ پر ذرا غصہ نہیں آتا کیونکہ اب اس کا مضمون ازبر ہو گیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں سے ڈانٹ کو

علیٰحدہ کر دیا جائے' یا بصورت نقصِ امن' ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغو معلوم ہوگی۔

ان کا آنا فرشتہ' موت کا آنا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زکام انھیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اور خسرہ میں موتی جھرے کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے' وہاں بے دھڑک بگل بجا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے اِنّاللہ تک کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ اُن کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اس قسم کی ہوتی ہے:

''میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح نبض پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ع

بیمار مباش کچھ کیا کر

مصرع کا جواب شعر سے دیتا ہوں:

کمزور میری صحت بھی' کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا' بیمار ہوا تو مر نہ سکا

یہ سن کر وہ بپھر جاتے ہیں اور اپنے سن وسال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سناتے ہیں کہ زندہ تو درکنار' مردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال و جواب کے لیے اُٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف جان بوجھ کر اپنی تن درستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خودکشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں جیتا' بلکہ آنکھ بند کر کے ان کی تجویز کردہ دوائیں کھا لیتا۔ (چراغ تلے)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے۔

i- مصنف کی رائے میں غالب نے ۱۲۷۷ء میں وبائے عام میں مرنا کیوں پسند نہ کیا؟

ii- بیمار کی مزاج پرسی کرنے والوں میں سرِ فہرست کون لوگ ہوتے ہیں؟

iii- مصنف نے ہمدردانِ صحت کو کتنے گروہوں میں تقسیم کیا ہے؟

2- ''پڑیے گر بیمار'' کا خلاصہ لکھیے۔

3- ہر سوال کے آخر میں چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں، درست جواب پر "✓" کا نشان لگائیے۔

i- ہمارے ہاں باعزت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہنر ہے جس کے لیے عمر بھر........ کرنا پڑتا ہے۔

ا۔ ریاض ب۔ تجربہ ج۔ ارادہ د۔ مجاہدہ

ii- میں اس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمۂ......... ہے۔

ا۔ علالت ب۔ عدالت ج۔ ملازمت د۔ عیادت

iii- میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو محض.......... کے خوف سے تندرست رہنا چاہتے ہیں۔

ا۔ عیادت ب۔ علاج ج۔ مہنگائی د۔ علالت

iv- شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ..........نہ بتائے۔

ا۔ دوا ب۔ دعا ج۔ نسخہ د۔ پرہیز

v- میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے..........غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔

ا۔ صحیح ب۔ مناسب ج۔ متوازن د۔ عمدہ

طب..........میں ہر کڑوی چیز کو مصفّیِ خون تصور کیا جاتا ہے۔

ا۔ قدیم ب۔ جدید ج۔ یونانی د۔ مشرقی

3- سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہو گیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرۂ علالت میں بہ نفسِ نفیس تشریف لائے اور خوب کرید کرید کر جرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں منکر نکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔"

4- فن کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی پر نوٹ لکھیں۔

مضمون

مضمون کا لفظ انگریزی لفظ Essay کا اُردو مترادف ہے۔خود انگریزی زبان میں یہ لفظ فرانسیسی سے آیا ہے۔اصطلاحی طور پر کسی متعین موضوع پر اپنے خیالات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔مضمون کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہے۔ مضمون کے لیے نظم وضبط، توازن اور تناسب ضروری خیال کیے جاتے ہیں۔اردو میں مضمون نویسی کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین قلم بند کیے۔سرسید احمد خاں کے رفقا میں حالی، شبلی، محسن الملک، نذیر احمد، وقار الملک اور چراغ علی نے بھی معیاری مضامین قلم بند کیے۔

مضمون پیرا گراف کی صورت میں ہوتا ہے یہ پیرا گراف منطقی انداز میں خیالات کے ارتقا کو پیش کرتے ہوئے اپنے منطقی انجام تک پہنچتے ہیں۔ مضمون میں ذیلی عنوان نہیں ہونا چاہئیں۔ شگفتگی، سنجیدگی، متانت ٹھوس دلائل، ربط اور موضوع سے وابستگی ایک اچھے مضمون کے لیے ضروری ہیں۔

(۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء)

سر سید احمد خاں

سر سید احمد خاں دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا خاندان حضرت میرزا مظہر جانجاناں کے سجادہ نشین شاہ غلام علی کا عقیدت مند تھا جبکہ والدہ کا خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے گھرانے سے عقیدت رکھتا تھا۔ آپ نے اپنے زمانے کے مروجہ علوم سیکھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو گئے آپ مراد آباد میں صدر الصدور رہے۔ یوں تو آپ نے مراد آباد اور غازی پور میں بھی انگریزی سکول قائم کیے، مگر آپ کا زندہ جاوید کارنامہ علی گڑھ سکول (۱۸۷۵ء) اور علی گڑھ کالج (۱۸۷۷ء) کا قیام ہے۔ یہی کالج بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے تاریخ میں زندہ ہے۔

سر سید احمد خاں کی تصنیف و تالیف کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ آپ نے تاریخ، تذکرہ، سوانح، فلسفہ، انشائیہ، سیرت، علم کلام اور تفسیر قرآن جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ حتیٰ کہ آپ نے ہومیو پیتھی پر بھی ایک رسالہ قلمبند کیا۔ رموز او قاف اور اردو گرامر پر بھی لکھا۔ آپ نے جس موضوع پر لکھا ایک نئی راہ تلاش کی اور ایک نیا انداز اختیار کیا۔ سر سیدؔ کی نثر کو سادگی، سلاست، مقصدیت اور سائنسی انداز فکر نے جدید نثر کا نقطۂ آغاز بنا دیا۔

کاہلی

یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں لوگ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے، مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔

ہاتھ پاؤں کی محنت اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور پیٹ بھرنا ایک ایسی چیز ہے کہ بہ مجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں کی کاہلی چھوڑی جاتی ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ اور وہ جو کہ اپنی روزانہ محنت سے اپنی بسر اوقات کا سامان مہیا کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ محنت کرنا اور سخت کاموں میں ہر روز لگے رہنا گویا اُن کی طبیعت ثانی ہو جاتی ہے، مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی حاجت نہیں ہے وہ اپنے دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ لوگ پڑھتے ہیں اور پڑھنے میں ترقی بھی کرتے ہیں اور ہزار پڑھے لکھوں میں سے شاید ایک کو ایسا موقع ملتا ہوگا کہ اپنی تعلیم کو اور اپنی عقل کو ضرورتاً کام میں لاوے، لیکن اگر انسان اُن کی عارضی ضرورتوں کا منتظر رہے اور اپنے دلی قویٰ کو بیکار ڈال دے تو وہ نہایت سخت کاہل اور وحشی ہو جاتا ہے۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اُس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے اور جسمانی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور انسانی صفت کو کھو کر پورا حیوان بن جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور اُن کو بیکار نہ چھوڑے۔

ایک ایسے شخص کی حالت کو خیال کرو جس کی آمدنی اُس کے اخراجات کو مناسب ہو اور اُس کے حاصل کرنے میں اُس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے اور وہ اپنے دلی قویٰ کو بھی بے کار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا یہی ہوگا کہ اس کے عام شوق وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہو جاتے جاویں گے۔ مزے دار کھانا اس کو پسند ہوگا اور یہی سب باتیں اُس کے وحشی بھائیوں میں بھی ہوتی ہیں، البتہ اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ پھوہڑ بدسلیقہ وحشی ہوتے ہیں اور یہ ایک وضع دار وحشی ہوتا ہے۔

پلنگ پر پڑے رہنا اور پیچوان کے دھوئیں اڑانا اُس کو پسند ہوتا ہے اور جنگل کے ریت پر پڑے رہنا اور ناریل میں تمباکو کے دھوئیں اڑانا اُس کو پسند ہوتا ہے۔ پس پیچوان اور ناریل اور بچھونے اور ریت کے فرق سے کچھ مشابہت میں جو ان دونوں میں ہے کمی نہیں ہوتی۔

ہم اپنے ہم وطنوں سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ہم کو اپنے قوائے دلی اور قوت عقلی کو کام میں لانے کا موقع نہیں رہا ہے اس کا بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے، یعنی اپنے دلی قویٰ کو بے کار چھوڑ دیا ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوت عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو اسی کی فکر اور کوشش چاہیے کہ وہ موقع کیونکر حاصل ہو۔ اگر اُس کے حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اُس کی فکر اور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قصور کیوں کر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہ چاہیے، کسی نہ کسی بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے، تا کہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی، یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ:

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر

سوالات

-1 مختصر جواب دیں:

-i انسان کن صفات کو کھو کر حیوان بن جاتا ہے؟

-ii سب سے بڑی کاہلی کیا ہے؟

-iii اگر انسان اپنے دلی قویٰ کو بیکار ڈال دے تو وہ کیسا بن جاتا ہے؟

-iv کاہل شخص کے بارے میں حکیمانہ قول کیا ہے؟

-2 مندرذیل الفاظ ومحاورات کے معنی لکھیے:

دھوئیں اڑانا، رفع ہونا، حکیمانہ، ضرورتاً، مشابہت، مستعدی

-3 سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اُس کے دلی قویٰ کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں لائی جاتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں پڑ جاتا ہے اور جسمانی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے اور انسانی صفت کو کھو کر پورا حیوان بن جاتا ہے۔ پس ہر ایک انسان پر لازم ہے کہ اپنے اندرونی قویٰ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں رہے اور اُن کو بیکار نہ چھوڑے۔"

(۱۸۴۴ء - ۱۸۹۵ء)

مولوی چراغ علی

مولوی چراغ علی رفقائے سرسید میں ایک اہم شخصیت ہیں۔آپ کے آباء واجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔دادا میرٹھ منتقل ہو گئے۔ان کے والد سرکاری ملازم تھے۔چراغ علی کی عمر بارہ سال کی تھی کہ والد وفات پا گئے۔انھوں نے روایتی تعلیم گھر پر حاصل کی۔والد کے ایک دوست کی وساطت سے سرکاری ملازمت حاصل کی۔ پھر سرسید کے وسیلے سے حیدرآباد دکن میں ملازم ہو گئے۔وہاں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔آپ نے ذاتی محنت سے انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا۔آپ کی اہم کتابیں اسی زبان میں ہیں۔

چراغ علی نے سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھے اور کتابیں تصنیف کیں۔آپ کی تحریر میں سادگی اور سلاست ہے۔استدلال کی پختگی آپ کی تحریر کو وزن اور وقار عطا کرتی ہے۔ان کی تحریروں میں آج بھی تازگی اور توانائی محسوس ہوتی ہے۔

احسان عام

اپنے ہم جنسوں سے شفقت اور نرمی برتنی تمام بنی نوع سے خیر اندیشی کرنی۔ ان کا بھلا چاہنا بلکہ اپنی منفعت پر غیر کی منفعت کو مقدم رکھنا۔ اپنے دشمنوں، مخالفوں اور بدخواہوں سے احسان و مروت اور عموماً دوستی کرنا بلکہ اپنے مخالفوں کی خطاؤں سے درگزر کرنا۔ اپنے دشمنوں کی بدخواہیوں کو معاف کرنا ان کی عداوت اور رنج دہی پر صبر کرنا اور برائی کے عوض ہمیشہ بھلائی کرنا۔ یہ عمدہ اور افضل محاسن اخلاق ہیں جو ہمارے اسلام اور قرآن نے ہم کو سکھلائے ہیں۔ ہر چند کہ حکمائے سابقین کئی زمانوں کے تجربہ اور عرصہ دراز کی فکر و غور سے ایسے محاسن اخلاق کے قریب قریب پہنچے تھے اور نہ کوئی ایک حکیم تھا جس نے یہ سب عمدہ مکارم اخلاق کی باتیں سکھلائی ہوں بلکہ مختلف اور متعدد حکیموں اور فلسفیوں نے بہت کچھ سرد و گرم زمانہ دیکھ کر ان میں سے بعض باتیں محاسن اخلاق کی بیان کیں۔ اِلّا چونکہ انسانی خیالات تھے۔ جن کا ٹھیک ٹھیک ہر ملک و مزاج کی مختلف طبیعتوں کے اندازہ کے موافق ہونا ان حکیموں کی عقل کی دور اندیشی سے باہر تھا اور خیالات انسانی افراط و تفریط سے بھی خالی نہ تھے۔ لہٰذا ان پر وثوق کلی اور اعتماد قطعی بغیر وحی کے انکشاف کے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ وحی الٰہی جس کا انکشاف تمام عالم پر قرآن کے ذریعہ سے ہوا، اس وحی کامل نے ان سب اخلاقِ حسنہ کو تمام و کمال ہر ایک زمانہ اور ملک کے مناسب حال اور اندازہ کے موافق ہم لوگوں پر ظاہر و منکشف کیا۔

اس بارے میں جو احکام ہم کو قرآن شریف کے ذریعہ سے ملے ہیں وہ ایسی واضح صورت میں نہیں ہیں کہ کسی خاص سورۃ یا رکوع میں بہ حیثیت مجموعی جمع کرا کے رکھا ہو جو کہ تصنع اور تکلف سے خالی نہ ہوتا اور جس سے کہ ایک طرح کے دکھلاوے کی ترکیب اور ظاہری بندش پائی جاتی ہے۔ بلکہ تمام مصحف میں ان پاک احکام اور عمدہ اخلاق کو ہر ایک قسم کے ذکر میں ایسی سچی مصلحت سے متفرق بیان کیا ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں کو ہر وقت اور ہر مضمون کے ساتھ ان نیکیوں اور اخلاق کی تنبیہ اور یاد دہانی ہوتی رہے اور اس وحی کے جس مقام کو بلا قصد اور بلا تعین پڑھا جاوے وہیں پر ان میں سے کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور پائی جاوے۔

ہم کو قرآن مجید یہ بات سکھلاتا ہے کہ ہم کو لازم ہے کہ بدی کے عوض میں نیکی کریں اور خدا کا یہ حکم محکم ہے کہ ہم اپنے دشمنوں سے برائی کے عوض میں بھلائی کریں۔

جو لوگ برائی کے عوض میں بھلائی کرتے ہیں انھی لوگوں کے لیے دار آخرت ہے۔

(سورۃ الرعد۔۲۲)

ان لوگوں کو دہرا اجر ملے گا اس لیے کہ اُنھوں نے صبر کیا اور بھلائی کرتے ہیں برائی کے بدلے۔ (القصص۔۵۴)

بری بات کا جواب وہ کہہ جو کہ بہتر ہے۔ (المؤمنون۔۹۲)

یہ صاف سی بات ہے کہ قرآن مجید نے ہم کو محض حکماً یہ بات سکھلا دی یا ہم اس کو بلا تصدیق محض ایمان کی راہ سے تسلیم کر لیں۔ نہیں بلکہ ایسی نیکی کرنے کی بدیہی دلیل اور صریح نتیجہ بھی بتلا دیا۔

برابر نہیں نیکی اور نہ بدی جواب میں تو کہہ اس سے بہتر۔ پھر تو دیکھے کہ جس میں تجھ میں دشمنی تھی جیسے دوست دار ناطے والا، اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے۔ (حم سجدہ: ۳۵)

پھر قرآن ہم کو یہ بھی سکھلاتا ہے کہ بدلہ لینا گو معروف یا مقتضائے عدالت ہو اور ایسا کرنا صحیح بھی ہے مگر اس کے کریمانہ اخلاق کا یہی حکم ہے کہ مخالفوں کی خطاؤں اور برائیوں کو معاف کرو اور عموماً درگذر کرو۔

برائی کا بدلہ ویسی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کرے اور سنوارے تو اس کا ثواب ہے اللہ کے ذمہ۔ (الشوریٰ: ۴۰)

اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جتنی تم کو تکلیف پہنچے اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنیوالوں کے لیے۔ (النحل: ۱۲۶)

اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ معاف کرے تم کو۔

(النور: ۲۲)

اس میں صاف سمجھا دیا کہ چونکہ تم اپنے گنہگاروں، خطا کاروں، دشمنوں اور مخالفوں سے ایسا شیوہ عفو و غفران کا اختیار کرو گے تو خدا بھی تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔

اس آیت میں ''اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ''[1] بڑی حکمت بھری ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ خدا ہماری خطاؤں کو معاف کرے تو لازم ہے کہ ہم بھی اپنے خطا کاروں کی تقصیریں معاف کریں اگر ہم توقع رکھتے ہیں کہ خدا ہم کو بخش دے تو ضرور ہے کہ ہم بھی اوروں کی خطائیں

---

[1] کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے۔ (النور: ۲۲)

بخش دیں۔ یہ آیت ہم کو صرف یہ سکھلاتی ہے کہ ہم ہمیشہ خدا سے دعا کریں کہ جیسے ہم اپنے تقصیرداروں کو معاف کرتے ہیں ویسے ہی خدا بھی ہماری تقصیریں معاف کرے۔

باہم کی معاشرت میں (خواہ ہمارے اہل معاشرت مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، دوست ہوں یا مخالف) عدل اور احسان برتنا اور انصاف مدنظر رکھنا ایک حکم محکم اور امر لازم ہے۔

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کو اور بھلائی کرنے کو۔

آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور نہ مدد کرو گناہ پر اور زیادتی پر۔

پھر اس سے بھی واضح کر کے صاف سمجھا دیا کہ کسی قوم کی عداوت تم کو عدل کرنے سے نہ باز رکھے اور کسی جماعت کی دشمنی تم کو انصاف کرنے سے نہ روکے۔ تم سب سے اپنے دوستوں سے اور دشمنوں سے عدل اور احسان اور انصاف برابر قائم رکھو۔

سوالات

1- مختصر جواب دیں:

i- کیا قرآن حکیم میں بار بار احسان کی تلقین کی گئی ہے؟

ii- کیا قرآن حکیم نے برائی کو برائی سے روکنے کی ہدایت کی ہے؟

2- سبق "احسان عام" کا خلاصہ لکھیے۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے۔

مصحف، درگزر، احسان، عفو، واضح، محکم، مقدم، مروت، محاسن، وثوق، انکشاف

4- اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- ہم کو لازم ہے کہ.......... کے عوض میں نیکی کریں۔

ii- اگر ہم چاہتے ہیں کہ خدا ہماری خطاؤں کو معاف کرے تو لازم ہے کہ ہم بھی اپنے خطا کاروں کی.......... معاف کریں۔

iii- کسی قوم کی عداوت تم کو.......... کرنے سے نہ باز رکھے۔

iv- وحی کامل نے ان سب اخلاق حسنہ.......... کو ہر ایک زمانہ اور ملک کے مناسب حال اور اندازہ کے موافق ہم لوگوں پر.......... کیا۔

(۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزاد

محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ جنھوں نے ۱۸۳۷ء میں دہلی سے پہلا اخبار ''اردو اخبار'' نکالا۔ یہ اخبار ۱۸۵۷ء تک شائع ہوتا رہا۔ آزاد نے پہلے اپنے والد سے اور پھر ذوق کے سایہء عاطفت میں تعلیم حاصل کی۔ آزاد کا شمار جدید اردو شاعری کے اولین معماروں میں ہوتا ہے۔ وہ محقق بھی تھے، ادبی مورخ، نقاد اور ایک تدریسی سلسلہ تصنیفات کے پیشرو بھی ہیں۔ مگر ان کی انشا پردازی ان کی سب حیثیتوں پر غالب ہے۔ وہ حقیقتاً اردو کے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ وہ اپنے انداز نگارش کی بنا پر آسانی کے ساتھ پہچانے جا سکتے ہیں۔ انھیں تمثیل نگاری میں کمال حاصل تھا۔

نقادوں نے بجا کہا ہے کہ اگر ادب کے عجائبات تاریخ بھی متعین کیے جا سکتے ہیں تو آزاد کے اسلوب کو انھی عجائبات اور طلسمات میں شمار کرنا پڑے گا۔ آزاد کی تصانیف میں ''قصص ہند''، ''آب حیات''، ''نیرنگ خیال''، ''دربار اکبری''، ''سخندان فارس'' اور ''نگارستان فارس'' شامل ہیں۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب وتکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہُوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اُونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہما، دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا، اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا، جس کا دامن، دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنّات کی تصویریں زردوزی میں کڑھی ہوئی تھیں اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغے میں ایک بھاری سی گٹھڑی لیے آتا ہے۔

جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینا بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا، اس نے بھی وہ بوجھ پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بُری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دودِ آہ کی گٹھڑیاں تھیں کہ انھی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہوسکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ نے جدوجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے۔ مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبارِ رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سقم اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمیوں نے خواہ مخواہ انھیں مرض سمجھ لیا تھا۔ مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا۔ اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بداطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا چلا آتا ہے۔ اس نے بھی ایک گٹھڑی پھینکی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی ناعاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انھوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے

بدن اور قد وقامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار پھینکا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا، یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرہ کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ پُر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولائی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے، جو سلطانِ افلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج وتکلیف تبدیل کر لیں اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز ومحترم معلوم ہوتا تھا، دردِ قولنج سے جان بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال واملاک کے لیے وارث چاہتا تھا اس نے دردِ مذکور کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا، چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ دردِ قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا، چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا دردِ قولنج مجھے پھیر دیجیے اور لڑکا لے لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ ہو سکتا تھا۔

ایک بیچارہ جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا، اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ور سر پکڑ کر بسور رہا ہے۔

غرض اس طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لیا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا، کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جُوعُ البَقَر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا

تھا، مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی، مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکہ بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا۔ مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطانِ افلاک کو بیکس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اُتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک فرشتۂ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات وسکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمتِ الٰہی پر توکّل کر کے نگاہ کو اُسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر و تحمّل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مصیبت کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا جو کوہ مذکور خود بخود گھٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اُٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اُٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبارِ لاانتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چننا نہ پڑا۔

(نیرنگِ خیال)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- سلطان افلاک کے دربار سے کیا اشتہار جاری ہوا؟

ii- وہم کی تصویر کس طرح پیش کی گئی؟

iii- پیر مرد کا واقعہ بیان کیجیے۔

iv- اس موقع پر کن چیزوں سے بہ آسانی نجات حاصل کی جاسکتی ہے؟

v- سقراط حکیم کے لطیفے سے کیا مراد ہے؟

2- سبق ''انسان کی حال میں خوش نہیں رہتا'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

3- اپنے استاد کی راہنمائی میں ''وہم پرستی'' پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

4- اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں .... بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا ہے۔

ii- تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ .... لگائیں۔

iii- اس کے ہاتھ میں ایک .... تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت .... معلوم ہونے لگتی تھی۔

iv- جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ .... کا عذاب تھا۔

v- مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی .... تھے۔

vi- ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے .... اڑ گئے۔

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

خواجہ الطاف حسین حالی

حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔لاہور میں آزاد کے ساتھ مل کر شعروشاعری کی خدمت کی اور جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔چار سال لاہور رہنے کے بعد دہلی چلے گئے اور اینگلو عربک کالج میں معلم ہوگئے۔ وہاں سرسید سے ملاقات ہوئی اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔اسی دوران میں مسدس مدو جزرِ اسلام لکھی۔۱۹۰۴ء میں شمس العلما کا خطاب ملا۔سرسید جس تحریک کے علمبردار تھے، حالی اس کے نقیب تھے۔نہ صرف یہ کہ انھوں نے اردو ادب کو صحیح ادبی رنگ سے آشنا کیا بلکہ آنے والے ادیبوں کے لیے ادبی تنقید، سوانح نگاری، انشا پردازی کے بہترین نمونے یادگار چھوڑے۔

حالی کی تصانیف میں ''تریاق سموم''، ''طبقات الارض''، ''مولود شریف''، ''تاریخِ محمدی پر منصفانہ رائے''، ''مجالس النساء''، ''حیاتِ سعدی''، ''یادگارِ غالب''، ''حیاتِ جاوید'' اور ''مقدمۂ شعروشاعری'' شامل ہیں۔

زُبانِ گویا

اے میری بُلبُل ہزار داستان ! اے میری طوطی شیوا بیان ! اے میری قاصد ! اے میری ترجمان ! اے میری وکیل ! اے میری زبان ! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل کا ایک نیا مزا ہے۔ کبھی تو ایک سحر فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد، نہ جادو کا اتار۔ کبھی تُو ایک افعی جاں گداز ہے جس کے زہر کا نہ دارو، نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تُو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی، روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تُو نے کہاں سے سیکھا۔ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھ ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تُو شہد ہے اور کہیں حنظل۔ کہیں تُو زہر ہے اور کہیں تُو تریاق۔

اے زبان ! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے سینکڑوں اور ہزاروں فائدے، ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی اور ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ صرف تیری ایک "ہاں" اور "نہیں" پر موقوف ہے۔ تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونہ قدرت الٰہی ہے۔ دیکھ اس طاقت کو رائیگاں نہ کر اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا، راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا، تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی، دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت اعلیٰ ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز، کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار

ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز ہے۔ علم ایک خزانہ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل اور تو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانہ کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب اعلیٰ تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو امید ہے کہ تُو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے، تُو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تُو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھاوے اور پھر وہی زبان کہلائے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تُو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبوں ہے بلکہ سراسر زیاں ہے، اگر تیرا قولِ صادق ہے تو شہدِ فائق ہے ورنہ تُھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گُفتار ہے، تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھنچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے، کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ او منہ پھٹ ان کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بدعہد اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی، غرض دنیا بھر کے عیبِ ان میں نکلے اور وہ ان سب کے سزاوار ٹھہرے۔ اے زبان! یاد رکھ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے، ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ! وہ نام کے جانور اور ان کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں ''نہیں'' اور زبان پر ''ہاں''۔

الٰہی! اگر ہم کو رفعتِ گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے اور دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے، جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین!

سوالات

-1 مختصر جواب دیجیے:

-i مصنف نے زبان کا کیا منصب بیان کیا ہے؟

-ii مصنف نے کن باتوں کو زبان کا غلط استعمال قرار دیا ہے؟

-iii بلبل ہزار داستان، طوطی شیوہ بیان، قاصد، وکیل، ترجمان کسے کہا گیا ہے؟

-iv زبان ماں باپ کا دل کیسے دُکھاتی ہے؟

-v زبان کا نام اور کام کیا ہے؟

-vi زبان کا خطاب اور لقب کیا ہے؟

-vii زبان کس وقت زبان کہلانے کی مستحق ہوتی ہے؟

-viii زبان کا حکم بجالانے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟

-ix انسان اور جانور میں کیا فرق ہے؟

-2 مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے:

ساحر، فسوں ساز، تہمت، غیبت، افعی، جان گداز، حنظل، پارۂ گوشت، زبوں، منصب، کاشف اسرار

-3 مندرجہ ذیل محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے:

ناصح مشفق، جی لبھانا، خاک میں ملانا، دل دکھانا، جی چرانا، ناک کٹوانا، جان پر کھیلنا طوفان اٹھانا۔

-4 سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

''الٰہی! اگر ہم کو رفعتِ گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے اور دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے، جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ آمین!''

(۱۹۰۶ء-۱۹۸۶)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ ضلع ہزارہ (ایبٹ آباد) کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ عملی زندگی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی فہرست سازی سے کیا۔ بعد ازاں یونیورسٹی ہی میں فارسی کے ریسرچ سکالر ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں اورینٹل کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں ریڈر، پروفیسر اور پھر پرنسپل بھی رہے۔ یہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد ''اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ'' کے صدر نشین کی حیثیت سے آخر عمر تک مصروف کار رہے۔

ان کی کتابوں میں نقدِ میر، ولی سے اقبال تک، وجہی سے عبدالحق تک، سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، اشاراتِ تنقید، مقاماتِ اقبال، مسائلِ اقبال، مباحث، شعرائے اُردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن وغیرہ شامل ہیں۔ سید عبداللہ کا طرزِ تحریر سادہ، رواں اور سلیس ہے۔

اندازِ بیاں مدلل اور سنجیدہ ہے، عالمانہ جمال وجلال، تحقیق وتنقید اور خطیبانہ جوش ان کی تحریر کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

اُردو ذریعۂ تعلیم

تمام دنیا میں، قومیں اپنی قومی زبان سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ اپنی قومی زبان کے لیے کسی کو اپنی ہی قوم سے لڑائی لڑنی پڑتی ہو۔ بدقسمتی سے پاکستان میں یہ صورت حال درپیش ہے۔ قومی زبان کو اپنا حق منوانے کے لیے اپنی ہی قوم سے لڑنا پڑ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم اور مرکزی مسئلہ قومی تعلیم کا ہے جو قومی زبان کی رفاقت سے محروم ہے۔ اس وقت تک تعلیم میں قومی زبان کو جو درجہ دیا گیا ہے اس پر اظہار اطمینان کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس پورے سلسلۂ عمل کو محض ابتدا سمجھنا چاہیے۔ ابھی اصل کام باقی ہے۔ اصل کام یہ ہے کہ پورے نظامِ تعلیم میں قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا ہوگا۔ تمام فنی یونیورسٹیوں میں اردو کے ذریعے تعلیم دینی ہوگی۔ پبلک سروس کمیشن صوبائی اور مرکزی میں قومی زبان کو پورا مضمون، ذریعہ امتحان اور انٹرویو کا ذریعۂ اظہار و گفتگو بنانا ہوگا۔ اور اہم بات یہ کہ دفتروں میں مسودات اور مجلّات کے لیے قومی زبان کو رائج کرنا ہوگا۔ عدالتوں کی انتہائی سطح تک اردو سے کام لینا ہوگا اور ایکٹ اردو میں بنوانے ہوں گے۔

تعلیم جہاں ایک نظری سلسلہ ہے وہاں اس کے عملی پہلو اور افادی مقاصد بھی ہیں۔ ذریعۂ تعلیم تبدیل ہو بھی جائے تو بھی اس وقت تک بے نتیجہ اور بے اثر ہوگا جب تک وہ زندگی کے اہم کاموں کے لیے مفید نہ ہوگا۔ تعلیم محض دماغی ورزش اور تفریحی مشغلہ نہیں۔ وہ ایک نافع اور فائدہ مند استعمال کی مشق ہے۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ دفتری زبان کی تبدیلی اور کاروباری زبان کی ترویج کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے میں عام مضامین کے ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پبلک سروس کمیشن، فنی تعلیم اور دفتری کاروباری زبان کی تبدیلی پر بھی زور دے رہا ہوں اور جب میرے دل کی دنیا پر بے کسی اور تنہائی کا احساس غالب آجاتا ہے تو یک آدھ مرتبہ یہ پیکرِ تصویر، کاغذی پیراہن پہن کر مال روڈ پر اردو کا فریادی بن جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دو تین عذرات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تیز مت چلو، تدریج کے ساتھ سب کچھ ہونا چاہیے،......... تدریج؟ بیشک تدریج! مگر تدریج کے معنے ہیں درجہ بدرجہ آگے بڑھنے کے! اس کے لیے لازم ہے کہ منزل متعین ہو، آغاز ہو اور کہیں انتہا بھی ہو، اس کے لیے معقول درجے مقرر کیے جائیں......... ہر درجے سے گزرنے کی مدت مقرر کی جائے اور

پھر سچے دل سے اس پر عمل ہو! منزل معلوم بھی ہو مگر مدت کا تعین نہ ہو تو کیا معلوم منزل کئی صد سال گزرنے پر بھی سامنے نہ آئے۔ گزشتہ چالیس برس میں اکثر یہی ہوا کہ تدریج کا مشورہ دیا گیا۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ مسئلہ انڈونیشیا، ایران، ترکی، جاپان، اسرائیل، چین وغیرہ بلکہ قدیم زمانے میں انگریزی میں بھی محض جذبات کے زور سے حل ہوا تھا.......... اور ان ممالک میں کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ قومی زبان کا سوال اٹھانے والے لوگ جذباتی ہیں۔ پھر بھی ہم ہر اس عقلی اور عملی اور تدریجی پروگرام کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے ملک کے اربابِ دانش تجویز کریں گے۔ کیونکہ اب ہم دل سے یقین رکھتے ہیں کہ سائنس اور فنون مفیدہ ولطیفہ کی تعلیم، اردو میں ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے اور اس اصول سے اختلاف کرنے والے جذباتی ہیں۔

سائنس کی تعلیم کے سلسلے میں، کتابوں اور نصابوں کی کمی کا اکثر ذکر ہوتا رہتا ہے.......... لیکن یہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ کسی منطقی نے ایک غریب دیہاتی سے پوچھا تھا: مرغ پہلے پیدا ہوا کہ انڈا؟ وہ چکرا گیا۔ مدتوں سے ہمارے یہاں بھی بڑے بوڑھے، نوعمروں کو اس سوال کے چکر میں پھنسا کر اپنی بزرگی کا سکہ بٹھاتے رہے۔

اگر سائنس کی تعلیم اردو میں نہیں ہوتی تو کتابیں لکھنے والے کس کے لیے کتابیں لکھیں گے؟ ضرورت کو قدیم زمانے سے ایجاد کی ماں بتایا جاتا ہے.......... اب ایجاد کی ماں یعنی ضرورت کا ارشاد یہ ہے کہ پہلے مجھے پیدا کرو پھر میں فوراً حاضر ہوں۔

اگر سائنس اردو میں پڑھی جائے گی تو چند برسوں کے اندر اندر سے نصابی پھر اعلیٰ اعلیٰ کتابیں خود بہ خود ظہور میں آجائیں گی.......... ! لیجیے یہ چکر تو ٹوٹا مگر یہ شوشہ ابھی باقی ہے کہ سب سے پہلی کلاس کا کیا ہوگا؟.......... اس کا جواب یہ ہے کہ استاد محنت کریں گے، انگریزی کتابوں کا مطالعہ کریں گے اور لیکچر اردو میں دیں گے.......... اس طرح ان کی مشق بھی ہو جائے گی اور نوٹ بھی تیار ہوتے جائیں گے.......... یہ ضروری ہے کہ اس کاروبار میں عاشقی کا انداز اختیار کرنا ہوگا۔ انڈونیشیا والوں کی طرح.......... استادوں کو ابتدائی دور میں واقعی محنت کرنا پڑے گی.......... ! اور یقین ہے کہ قوم ان تعلیمی رہنماؤں کی شکر گزار ہوگی جو اس ابتدائی دور میں عزم وہمت کا ثبوت دیں گے۔ لیکن یہ بات تو صرف تعلیم کی ہے۔ قومی زندگی کے باقی شعبوں میں مثلاً دفتروں میں، عدالتوں میں، کچہریوں میں، جلسوں میں، کانفرنسوں میں غرض ہر جگہ اردو کی ترویج لازمی ہے تا کہ قوم کی قومیت پہچانی جائے۔

قیام پاکستان تک مسلمانانِ ہند کی یہ متفقہ آواز تھی کہ اردو ہماری سب کی اور سب سے بڑی تہذیبی و قومی زبان ہے مسلم لیگ نے ۱۹۰۶ء میں جو یاداشت شملہ میں وائسرائے ہند کے سامنے پیش کی تھی اس کا اولین مطالبہ بھی اردو زبان کا تحفظ تھا۔ ظہور پاکستان کے بعد پہلے دو برسوں میں کراچی کی تعلیمی کانفرنس، لاہور کی ترقی پسند مصنفین کانفرنس، پنجاب یونیورسٹی کی پہلی اردو کانفرنس، پاکستان کے وزرائے تعلیم اور ڈائریکٹروں کی کانفرنس اور پنجاب یونیورسٹی کے اہم فیصلے اور اہم عملی اقدامات اس امر کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں کہ اس وقت تک بھی قوم میں اردو کے لیے پورا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں مشرقی پاکستان[1] سے کچھ اختلافی آوازیں اٹھیں تو قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۸ء میں خود ڈھاکہ پہنچ کر اعلان کیا کہ صرف اردو ہی ملک کی سرکاری زبان ہوگی البتہ صوبائی دائرے میں بنگلہ کے حق میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے لیکن ملک کی سرکاری زبان اردو، صرف اردو ہوگی۔ ۱۹۵۴ء میں دستور ساز اسمبلی نے بھی مرحلۂ اول میں غیر مبہم الفاظ میں اردو کا حقِ اوّل تسلیم کیا اور پاکستان کی تعلیمی کانفرنس نے بھی ذریعۂ تعلیم کو بدلنے کی پرزور سفارشات کیں۔

قائداعظمؒ کا انتقال ۱۱- ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا، اس کے بعد اختلافی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ ۱۹۵۳ء میں ایک تاریخی کانفرنس کے موقعے پر سیّد سلیمان ندوی کے خطبے کے خلاف ڈھاکا میں بڑی شورش اٹھی اور وہ بالآخر بڑھتے بڑھتے اس نتیجے پر پہنچی کہ ۲۰- اپریل ۱۹۵۴ء کو اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان بنادینے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ صورتِ حال مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک قائم رہی۔ ۱۹۵۶ء کے دستور میں اردو اور بنگلہ کو سرکاری زبانیں قرار دینے کے بعد یہ بھی طے پایا تھا کہ آئین کے نفاذ کے بعد بیس سال کے عرصے کے لیے انگریزی کو حسبِ سابق تمام سرکاری کاموں کے لیے استعمال کیا جائے گا اور آئین کے نفاذ کے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو انگریزی زبان کی جگہ متبادل انتظامات کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔

۱۹۵۸ء میں جب جنرل محمد ایوب خان نے ملک پر مارشل لا لگا دیا اور ۱۹۵۶ء کا دستورِ اساسی کالعدم ہوگیا تو فوجی حکومت نے مختلف معاملات کو ازسرِنو دیکھنے کے لیے کئی کمیشن قائم کیے۔ ان میں ایک تعلیمی کمیشن بھی تھا جس کے چیئرمین ایس۔ ایم۔ شریف تھے جو مرکزی حکومت کے سیکرٹری تعلیمات تھے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ''شریف کمیشن'' کا اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے دونوں قومی زبانوں کی مؤثر حیثیت کو پہلی مرتبہ عملاً تسلیم کرلیا۔ رپورٹ میں ایک باب ذریعۂ تعلیم کے بارے

---

[1] موجودہ بنگلہ دیش

میں بھی ہے جو نہایت بنیادی اور اہم دستاویز ہے جس سے اردو اور بنگلہ کے ذریعۂ تعلیم بننے کا حق فائق ثابت ہو جاتا ہے۔ مغربی پاکستان[1] میں پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک (ماسوا سرحد و سندھ) ذریعۂ تعلیم اردو کو تجویز کیا گیا۔ سرحد اور سندھ میں اردو کا مضمون تیسری جماعت سے لازمی بنا دیا گیا ہے۔ اردو (سندھ کے سوا ہر جگہ) مغربی پاکستان میں لازمی ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم اسکولوں میں بھی اردو کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے کا انتظام ہوا۔ جس طرح باقی اسکولوں میں تھا۔ گیارھویں اور بارھویں جماعت میں (مغربی پاکستان میں) ذریعۂ تعلیم انگریزی اور اردو دونوں میں حسبِ مرضی انتخاب جائز قرار پایا۔ بی۔ اے اور اس کے بعد تبدیلی کی سفارش مناسب وقت کے بعد تجویز ہوئی اور ''ترقی اردو بورڈ'' قائم ہوا۔ اس سفارش کے ساتھ کہ پندرہ برس کے اندر اندر اردو زبان کو اصطلاحات اور کتب حوالہ اور نصابات کی حد تک تیار کرے۔ آرٹس میں پندرہ سال سے بھی پہلے مگر سائنس کے مضامین کی پندرہ برس کی تیاری کے بعد تبدیلی عمل میں لانی تجویز ہوئی۔ اس سلسلے میں ۱۹۶۱ء میں متعلقہ آرڈی نینس جاری ہو گئے۔

جب دورِ ایوبی ختم ہو گیا اور جنرل یحییٰ خان نے مارشل لا لگایا تو ۱۹۶۹ء میں ایئر مارشل نور خان کی سربراہی میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے جولائی ۱۹۶۹ء تک اپنا کام ختم کر دیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ نور خان کمیشن کی متعلقہ سفارشات پاکستانی قومیت کی روح کے عین مطابق تھیں اور ان میں انگریزی کے مقابلے میں اردو کا پلڑا بھاری رکھا گیا تھا۔ نور خان کمیشن کی صرف ایک سفارش کا یہاں حوالہ دیتا ہوں۔ جس میں یہ لکھا ہے کہ ''تعلیم کی اعلیٰ سطح پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے میں حاکم اور محکوم کی تفریق کا تاثر پایا جاتا ہے جسے جاری رکھنا بے حد نقصان دہ ہوگا اور یہ بھی کہ ۱۹۷۴ء تک دفتروں میں قومی زبان کو مکمل رائج ہو جانا چاہیے۔''

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد نیا آئین ۱۹۷۳ء میں نافذ ہو گیا۔ اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ پندرہ سال (۱۹۸۸ء) کے اندر اندر اس کے نفاذ کے انتظامات مکمل ہو جانے چاہییں۔ اس کی مستثنیات بھی ہیں۔ آئین کی لسانی شقیں بھی محفوظ رہیں اور جب ''مقتدرہ قومی زبان'' نے اپنا کام شروع کیا تو انھی شقوں کے ماتحت اگرچہ تیاری کے چند سال ضائع ہو چکے تھے لیکن مقتدرہ نے بڑی ہمت سے تیاری کا کام جاری رکھا اور ''مقتدرہ'' کے

---

[1] موجودہ پاکستان

علاوہ ''اردو سائنس بورڈ'' لاہور ''اردو لغت بورڈ'' اور دیگر اداروں نے بھی اپنا کام جاری رکھا۔ مقتدرہ نے چند کمیٹیاں ذریعہ تعلیم زبان و دفتری وغیرہ کے متعلق قائم کیں۔

ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کا مسئلہ نیا نہیں خاصا پرانا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ قیامِ پاکستان سے بھی پہلے کا ہے۔ چنانچہ یہ تجربہ دلی کالج (۲۵-۱۹۲۶ء) اور بعد میں مختلف تجربوں سے گزرتا ہوا جامعہ عثمانیہ پہنچا جس میں مکمل تبدیلی کا عمل شروع بھی ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آغاز سے ہی یعنی ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد مسلسل یہ مسئلہ سامنے آتا رہا مگر خود اردو کی قومی حیثیت مکمل طور پر متعین نہ ہو سکی اس لیے یہ معاملہ بھی وسیع تر معاملے سے وابستہ ہو کر ملتوی ہوتا رہا۔

''مقتدرہ قومی زبان'' کی تاسیس کے بعد اس مسئلے پر زیادہ سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ غور ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ اس کی ایک ذیلی کمیٹی برائے ذریعۂ تعلیم نے طویل غور و فکر کے بعد چند جامع سفارشات لیں جو مارچ ۱۹۸۳ء میں حکومت کے سامنے آئیں اور ان پر کچھ تنقید و تبصرے کا عمل ہوا مگر فیصلہ کچھ نہ ہوا۔ دوسری بلکہ تیسری بار پھر حکومت کی اردو کابینہ سب کمیٹی کے سامنے نومبر ۱۹۸۵ء میں رکھی گئیں۔ مقتدرہ کی سفارشات جو مارچ ۱۹۸۳ء میں حکومت کے سامنے پیش ہوئیں اور نومبر ۱۹۸۵ء میں پھر پیش ہوئیں:۔

۱۔ انٹرمیڈیٹ سائنس، آرٹس، کامرس گروپ اور بی۔ کام ''بی۔ ایڈ'' ایل۔ ایل۔ بی، ٹیکنیکل ڈپلوما میں ۸۴-۱۹۸۳ء سے اردو کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے اور ۸۵-۱۹۸۴ء تک یہ کام مکمل ہو جائے۔

۲۔ ۸۶-۱۹۸۵ء سے بی۔ ایس۔ سی، بی۔ اے، ایم۔ اے، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، ایم۔ اے، ایم۔ کام، ایم۔ ایڈ، ایل۔ ایل۔ ایم میں اردو کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کیا جائے اور یہ کام ۸۷-۱۹۸۶ء میں پایہ تکمیل کو پہنچے۔

۳۔ ۹۸-۱۹۸۶ء سے ایم۔ ایس۔ سی اور ایم۔ بی۔ اے کے نصاب اردو میں شروع کیے جائیں اور یہ کام ۸۹-۱۹۸۸ء میں اختتام کو پہنچے۔

اگر سائنس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انگریزی میں سائنس نے اس وقت ترقی کی جب وہ فرنچ اثرات سے نکلنے کی سعی کرنے لگی۔ چنانچہ فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء-۱۶۲۶ء) اور بعد میں نیوٹن (۱۶۴۲ء-۱۷۲۷ء) اسی خواہش آزادی کے دور کے لوگ تھے جن کی مثال پر بعد میں اور لوگ برابر آگے بڑھتے گئے اور انگریزی کو مخزن علوم بنا دیا۔ یہ سب براہ راست اپنی زبان میں

سوچ اور ذاتی تجربے و مشاہدے سے ہوا اور دراصل تجربہ ہی سائنس کا سرچشمہ ہے۔

(تعلیمی خطبات)

سوالات

-1 مختصر جواب دیجیے:

-i قومی زبان کے نفاذ کے لیے کیا مشکلات درپیش ہیں؟

-ii قومی زبان کے سلسلے میں اصل کام کیا باقی ہے؟

-iii ذریعۂ تعلیم اردو ہونے سے کیا فائدہ ہوگا؟

-iv قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا میں اردو کے بارے میں کیا اعلان کیا تھا؟

-v شریف کمیشن نے اردو کے بارے میں کیا سفارش پیش کی تھی؟

-vi نور خان کمیٹی میں اردو کے بارے میں کیا سفارش پیش کی گئی تھی؟

-2 اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

-i تمام دنیا میں .... اپنی قومی زبان سے پہچانی جاتی ہیں۔

-ii .... کو اپنا حق منوانے کے لیے اپنی ہی قوم سے لڑنا پڑ رہا ہے۔

-iii پورے نظام تعلیم میں قومی زبان کو ذریعہ .... بنانا ہوگا۔

-iv .... اور فنون مفیدہ ولطیفہ کی تعلیم اردو میں ہو سکتی ہے۔

-v اردو ہماری سب کی اور سب سے بڑی .... وقومی زبان ہے۔

-vi نور خان کمیشن کی متعلقہ سفارشات پاکستان .... کی روح کے عین مطابق تھیں۔

-vii ہم انگریزی لازمی کے ہر حال میں حامی بلکہ .... ہیں۔

-3 سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے:

"تعلیم جہاں ایک نظری سلسلہ ہے وہاں اس کے عملی پہلو اور افادی مقاصد بھی ہیں۔ ذریعۂ تعلیم تبدیل ہو بھی جائے تو بھی اس وقت تک بے نتیجہ اور بے اثر ہوگا جب تک وہ زندگی کے اہم کاموں کے لیے مفید نہ ہوگا۔ تعلیم محض دماغی ورزش اور تفریحی مشغلہ نہیں۔ وہ ایک نافع اور فائدہ مند استعمال کی مشق ہے۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ دفتری زبان کی تبدیلی اور کاروباری زبان کی ترویج کے ساتھ لازم وملزوم کا تعلق رکھتا ہے۔"

-4 اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

شخصیت نگاری

شخصیت نگاری میں کسی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ شخصیت نگاری میں کسی شخص کے بنیادی مزاج، طبع، انداز فکر وعمل اوراس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں۔ اختصار اور جامعیت شخصیت نگاری کے بنیادی اوصاف ہیں۔ شخصیت نگاری میں ہم کسی شخص کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔ شخصیت نگاری میں مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مولوی عبدالحق، اشرف صبوحی، شاہد احمد دھلوی، سعادت حسن منٹو اور محمد طفیل کے نام بڑے نمایاں ہیں۔ سچائی، واقفیت اور غیر جانبداری کے ساتھ شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال شخصیت نگاری کے اوصاف میں شامل ہیں۔ جب کہ بے جا عقیدت اور ہیرو پرستی شخصیت نگاری کی سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ شخصیت نگاری میں زندگی کے ایسے گوشوں کو نمایاں کیا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے شخصیت کا پورا رنگ نکھر آئے۔

(۱۸۸۴ء۔۱۹۴۷ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول دہلی میں پائی اور پھر سینٹ سٹیفنز کالج سے بی۔اے کیا۔ اسی زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد جیسے فاضل سے عربی پڑھی۔ بی۔اے کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں رام پور، الہ آباد، آگرہ ہوتے ہوئے حیدرآباد دکن میں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے، پھر مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں ترقی کر کے ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔

فرحت اللہ بیگ کی ادبی حیثیت اور شہرت کا باعث ان کے وہ مضامین ہیں جو "مضامین فرحت" کے عنوان سے پانچ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اگرچہ بعض تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، مگر ان کا اصل میدان مزاحیہ مضمون نگاری ہے، جس کی بدولت ان کا شمار اردو کے بلند پایہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔

نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر، دادا جان کا پارلیمنٹ میں جانا، کل کا گھوڑا، نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی، ایک وصیت کی تعمیل، پھول والوں کی سیر، دلی کا آخری یادگار مشاعرہ، ان کے مشہور مضامین ہیں۔ ان کی تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ وہ بات کو براہ راست کہنے کے عادی ہیں۔ "جو کچھ ہونا چاہیے" کے بجائے "جو کچھ ہے" کو پیش کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کے ہاتھوں میں شخصیت اپنی اصلی صورت میں ڈھل کر افسانہ بن جاتی ہے۔

نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی

۱۹۰۳ء میں میاں داتی نے اور میں نے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا اور دونوں مشن کالج میں داخل ہو گئے۔انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بی۔اے میں عربی لے لو اور دونوں کو ایک دوسرے سے مدد ملے گی اور امتحان کی تیاری میں سہولت ہوگی۔ مجھے اپنے حافظہ پر گھمنڈ تھا، یہ بھی نہ سمجھا کہ اس مضمون کو سنبھال بھی سکوں گا یا نہیں، جھٹ راضی ہو گیا۔ القصہ ہم دونوں بی اے کے درجہ ابتدائی میں شریک ہو گئے۔ ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے، بڑے اللہ والے لوگ تھے، عربی کا گھنٹا بآسانی تصوف کی باتوں میں گزر جاتا تھا، کچھ تھوڑا بہت پڑھ بھی لیتے تھے۔ داتی کچھ سمجھتے ہوں تو سمجھتے ہوں۔ کمترین تو طوطے کی طرح حفظ کر لیتا تھا۔ اب رہی صرف ونحو، اس میں تو کورے کا کورا ہی رہا۔ سنتے آئے ہیں کہ ''مصیبت کہ کر نہیں آتی''۔ لیکن یہ نہیں سنا تھا کہ ''عربی کے پروفیسر کہ کر نہیں جاتے'' ایک دن مولوی صاحب کے کمرے میں ہم دونوں پہنچے تو دیکھا کہ کمرہ خالی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کل شام کو استعفا دے کر کعبۃ اللہ چل دیے۔ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچے، ان سے پوچھا کہ دوسرے صاحب کب آتے ہیں، تو انھوں نے کورا جواب دے دیا کہ ہم عربی کا بندوبست نہیں کر سکتے، بہتر یہ ہے کہ مضمون تبدیل کر لو۔ دونوں سر ملا کر بیٹھے، مشورے کیے، رزولیشن پاس ہوئے، آخر یہ تجویز پاس ہوئی کہ ''خاک از تودۂ کلاں بردار'' کے مقولے پر عمل کر کے کسی زبردست مولوی کو گھیرنا چاہیے، دلی میں دو تین بڑے عربی داں مانے جاتے تھے، ایک مولوی محمد اسحاق صاحب دوسرے شمس العلما، مولوی ضیاء الدین خان صاحب ایل ایل ڈی اور تیسرے مولوی نذیر احمد خاں صاحب۔

مولوی صاحب ہی کی ہمت تھی کہ وہ ہمارے پڑھانے کو تیار ہو گئے۔ بے چاروں کا ایک منٹ خالی نہ تھا اور انھوں نے جو وقت ہم کو دیا تھا وہ اپنے آرام کے وقت میں سے کاٹ کر دیا تھا، تقریباً دو برس تک ہم ان سے پڑھتے رہے، نہ ہم نے کبھی گرمی یا سردی کی شکایت کی اور نہ کبھی وقت بدلنے کا لفظ زبان پر لائے۔ نہ ان دو سال میں ایک دن ناغہ کیا۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب بھی ہمیشہ کہتے تھے کہ بیٹا جب تم دونوں آتے ہو میرا دل خوش ہو جاتا ہے، کیونکہ میں تم میں طالب علمی کی بُو پاتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تعلیم کس کو کہتے ہیں اور علم کیونکر حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح

ہم نے پڑھا ہے کچھ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم کا ذکر کروں، میں مولوی صاحب کی شکل وصورت، مکان کی حالت، ان کے رہنے سہنے کے طریقے اور ان کے مشاغل کا نقشا کھینچ دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔ تا کہ مولوی صاحب کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ ہو سکے لیکن سینومیٹوگراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں کیوں کہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائے گی لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے اور اگر آپ ان کی صحبت میں رہے ہوتے تو آپ کو بھی ان کے حالات لکھتے وقت میری طرح معافی مانگنی پڑتی۔ ورنہ آپ کی تحریر بجائے مولوی نذیر احمد صاحب کی سوانح عمری کے کسی ٹھیٹھ ملا کے بے لطف واقعات کا ایک مجموعہ ہو جاتی۔ وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مقطع اور مُسمسے شاگردوں سے نفرت ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ توقع رکھیں کہ میں مولوی صاحب کے حالات متانت کا پہلو اختیار کر کے لکھوں تو میں اس کا صرف یہی جواب دوں گا کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"۔

لیجیے اب مولوی صاحب کا حلیہ سُنیے:

رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصا اونچا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا، ورزش چھوڑ دینے سے بدن جس طرح مرمروں کا تھیلا ہو جاتا ہے بس یہی کیفیت تھی۔ بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا۔ کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ فگن تھیں، آنکھوں میں غضب کی چمک تھی، وہ چمک نہیں جو غصہ کے وقت نمودار ہوتی ہے بلکہ یہ وہ چمک تھی جس میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اگر میں ان کو "مسکراتی ہوئی آنکھیں" کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔

اب رہی لباس کی بحث تو اس کا بھی حال سن لیجیے۔ جنھوں نے اسٹیج پر ان کو شالی رومال باندھے کشمیری جبہ یا ایل ایل ڈی کا گون پہنے دیکھا ہے انھوں نے عالی جناب شمس العلما مولوی

حافظ نذیر احمد صاحب مدظلہ عالی کو نہیں دیکھا، ان کے گھر کے اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر ان کو روزانہ باہر نکلنے کا شوق نہ ہوتا تو لباس کی مد ہی ان کے اخراجات کی فہرست سے نکل جاتی، جب شام کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔ گرمیوں میں نہایت صاف شفاف سفید اچکن یا کشمیری کام کا جبہ چونکہ سراج دین صاحب سے لین دین تھا۔ اس لیے لال نری کا سلیم شاہی جوتا زیادہ استعمال کرتے تھے پھر بھی وقت بے وقت کے لیے دو انگریزی جوڑے لگا رکھے تھے جن پر میری یاد میں پالش ہونے کی کبھی نوبت نہ آئی، یہاں تک کہ دونوں سوکھ کر کھڑنک ہو گئے تھے۔

خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کے کھانا کھاتے تھے، ناشتہ میں دو (۲) نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے، میوہ کا بڑا شوق تھا۔ ناشتا اور کھانے کے ساتھ میوہ کا ہونا لازم تھا۔ پڑھاتے جاتے اور کھاتے جاتے تھے۔ مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کبھی شریک طعام نہ ہو سکا۔ خیر ان پٹھانوں کی جماعت کی تو کیا صلاح کرتے ان کے لیے تو مولوی صاحب کا ناشتا اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ ہو جاتا البتہ ہم دونوں کی صلاح نہ کرنا غضب تھا۔ کہتے بھی جاتے تھے بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے، میاں کیا مزے کا آم ہے مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔ میں نے تو تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا بھی یہی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں گے۔

دوسری دفعہ جو میں ملا تو مولوی صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ چھت پر جو چھوٹا کمرہ تھا اس میں آرہے تھے، رعشہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ پلنگ پر بیٹھے رہتے تھے، میں نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی بڑی زور سے سلام کیا۔ کہنے لگے ''کون صاحب ہیں۔ نام کیوں نہیں بتاتے، ارے بھئی اب مجھے صاف نہیں دکھائی دیتا۔ ذرا قریب آؤ۔'' میں نے کہا ''واہ مولوی صاحب، واہ اگر آواز سے نہیں پہچانا تو خوب پہچانا، دور سے پہچانتے تو بات ہے''۔ ایک دفعہ ہی ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ''اوہو، میاں فرحت ہیں۔ بھلا اور کون یہ بے تکی باتیں کرے گا۔ آؤ بیٹا! آؤ اب کے تو کئی برس کے بعد آئے۔'' میں پاس گیا، گلے لگایا، حالات پوچھتے رہے۔

حیدر آباد آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس چہکتے ہوئے بلبل نے اس گلشن دنیا سے کوچ کیا۔ جب کبھی دہلی جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں اندر قدم نہیں

رکھتا مگر بڑی دیر تک دیوار سے لگ کر دروازے کو دیکھتا رہتا ہوں اور رہ رہ کر ذوق کا یہ شعر زبان پر آتا ہے: ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اللہ بس باقی ہوس۔

(مضامینِ فرحت)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- مصنف کے عربی کے پروفیسر کون تھے؟

ii- دلی میں تین بڑے عربی دان کون حضرات مانے جاتے تھے؟

iii- مصنف اور ان کے دوست کے تعلیمی شغف کے بارے میں مولوی صاحب نے کیا تبصرہ کیا؟

iv- مصنف نے مولوی صاحب کا کیا حلیہ بیان کیا ہے؟

v- مولوی نذیر احمد کے گھر اور باہر کے لباس کے بارے میں بتائیے۔

vi- خوراک کے معاملے میں مولوی صاحب کا کیا معمول تھا؟

2- ہر سوال کے آخر میں چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں، درست جواب پر "✓" کا نشان لگائیے۔

i- .... میں میاں دانی نے اور میں نے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔

ا۔ ۱۹۰۳ ب۔ ۱۹۰۵ ج۔ ۱۹۰۷ د۔ ۱۹۰۹

ii- ہمارے.......... کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے۔

ا۔ عربی ب۔ اردو ج۔ فارسی د۔ ریاضی

iii- اگر مولوی صاحب خود اپنی.......... لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے۔

ا۔ آپ بیتی ب۔ سوانح عمری ج۔ کہانی د۔ داستان

iv- جب..........کو گھر سے نکلتے تو عموماً ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ باندھ کر نکلتے تھے۔

ا۔ شام ب۔ صبح ج۔ دوپہر د۔ رات

v- ناشتہ اور کھانے کے ساتھ..........کا ہونا لازم تھا۔

ا۔ دودھ ب۔ گوشت ج۔ میوہ د۔ شربت

جب کبھی..........جاتا ہوں تو مولوی صاحب کے مکان پر ضرور جاتا ہوں۔

ا۔ دہلی ب۔ لکھنؤ ج۔ کانپور د۔ بنارس

3- اس سبق کی مدد سے ڈپٹی نذیر احمد کا مختصر خاکہ تحریر کریں۔

4- سیاق وسباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل عبارت کی تشریح لکھیے:

"وہ دوسروں کو ہنساتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اپنی باتوں سے ان کو ہنسائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم (اور خاص کر میں) مولوی صاحب کے سامنے بہت شوخ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ طرح ہی نہیں دیتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ مجھے مقطع اور مُسمسے شاگردوں سے نفرت ہے۔"

(۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء)

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی یو۔پی کے ضلع جونپور کے ایک دیہات مڑیا میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم جونپور میں حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے۔ آپ نے طالب علمی کے زمانے سے مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کیے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۲۲ء میں وہیں کالج میں اردو کے پروفیسر ہو گئے اور جب یونیورسٹی بنی تو اردو ادبیات کا شعبہ قائم ہوا۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی کو صدر شعبہ بنا دیا گیا۔

وہ شعر و ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ادب کے بڑے اچھے استاد ہیں۔ ان کی زندگی شرافت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی چند اہم تصانیف میں مضامین رشید، خنداں (مزاحیہ مضامین)، ہم نفسانِ رفتہ، گنج ہائے گرانمایہ (سوانحی خاکہ)، طنزیات و مضحکات (اردو طنز و مزاح کی تنقیدی تاریخ) شامل ہیں۔

مولانا ابوبکر صاحب

مولانا میرے، ہم وطن تھے کیا بتاؤں کہ میں ان کو کب سے جانتا ہوں ان کی شخصی خوبیوں کو بچشم خود دیکھا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سنی۔ کتابوں میں پڑھی اور دلوں میں پائی۔ ابتدائی باتیں تو حافظے کے دور دراز افق پر کسی پرندے کی موہوم تھکی ہوئی پرواز کی مانند گم ہوتی جارہی ہیں۔ اب ان کو کون واپس بلائے کس دل سے بلائے اور بلانے سے حاصل ہی کیا؟

علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا، اس نے اپنا بنالیا، یہ بڑا ہی سخت گیر اور شکی محبوب ہے۔ نہیں چاہتا کہ اس کے ادنیٰ مطالبات سے بھی گریز کیا جائے یا اس کے سوا کسی اور سے التفات کی جائے۔ اس قید سے مخلصی کہاں۔ جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے تو معاً دل میں سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ علی گڑھ کا ہے یا نہیں؟ نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا کہ ایسا اچھا آدمی علی گڑھ کے فیضان سے محروم رہا اور جب معلوم ہوتا کہ یہیں کا ہے تو فخر سے گردن اونچی اور مسرت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا ایک راز تھا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

پندرہ سولہ سال ہوئے یونیورسٹی میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہوئی میرے ذہن میں یک لخت یہ بات آئی کہ مولانا یہاں آجائیں تو خوب ہو۔ حُسن اتفاق سے جلد ہی وطن جانے کا موقع ملا۔ مولانا سے استمزاج کیا۔ اب تک یاد ہے مولانا ایک کھرّی چارپائی پر لیٹے ہوئے بستر پر سر رکھے عالم شوق میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے۔ میں نے پہنچ کر سلام کیا تو وعلیکم السلام اس لطف سے کہا جس سے محسوس ہوا کہ میرے آنے کی مولانا کو بڑی خوشی ہوئی اور سلام کا یہ جواب ایک طویل اور پرخلوص صحبت کی دعوت ہے۔ ہر ملنے والے سے خواہ وہ اجنبی اور نو وارد ہی کیوں نہ ہو مولانا کا یہی اندازِ پذیرائی تھا۔ خود اٹھ بیٹھے اور مجھے بھی اپنی چارپائی پر بٹھالیا۔ اپنے لمبے رومال کو جو پاس ہی رکھا تھا، اس طور پر گھسیٹتے اٹھایا کہ جس جگہ میں بیٹھنے والا تھا اس کو جھاڑ پونچھ دینا مقصود تھا۔ بولے کہو علی گڑھ کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا مولانا ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ بولے کہو، ضرور کہو، وہ ان کا مستعدی اور ولولے سے اس طور پر ہمہ تن تیار ہو جانا جیسے ضرورت ہو تو کام پورا کرنے کے لیے وہیں سے میرے ساتھ ہو جائیں۔

میں نے کہا علی گڑھ میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہے۔ آپ قبول کر لیتے تو بہت اچھا ہوتا، کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ آپ کا سیاسی مسلک اور ہے، علی گڑھ کا اور۔ فرمایا: مسلک کی تو بات نہیں، مسلک تو ایک ہی ہے اور وہ مسلک ہے اسلام کا۔ میں نے کہا یہ تو میں سمجھتا ہوں لیکن یہ کون سمجھائے اور سمجھے کہ کونسا مسلک کیا ہے۔ بولے سمجھنے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا صحیح اور سچا راستہ دریافت کرنے اور اس پر چلنے میں تو ممکن ہے دقت ہو لیکن صحیح اور سچا آدمی آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ تمھارا علی گڑھ مصالح کا شکار ہے۔ مصلحت اندیشی اچھی چیز ہے لیکن مصلحت پرستی تنزل کی جڑ ہے۔ کچھ دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد عرض کیا کہ مولانا تو پھر بسم اللہ علی گڑھ تشریف لے چلیے۔ وہاں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ بولے: کیا مضائقہ لیکن میں دوڑ دھوپ کرنے اور سفارش بہم پہچانے کے چکر میں نہ پڑوں گا۔ میں نے کہا: یہ مجھ پر چھوڑیے، میں تو صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتا تھا۔

میں چلنے لگا تو بولے: دیکھو اس سلسلہ[1] میں کوئی بات ایسی نہ کرنا جو تمھارے یا میرے شایانِ شان نہ ہو، میرا اشمار کچھ بہت کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے لیکن روپیا پیسا کے علاوہ اللہ کا دیا ہوا اور بزرگوں کا سپرد کیا ہوا اور بہت کچھ موجود ہے۔ مجھے نوکری کی نہ خواہش ہے اور نہ ضرورت۔ تم کہتے ہو کہ علی گڑھ چلوں میں بھی سوچتا ہوں کہ کچھ دن یہ شغل بھی رہے تو کیا ہرج۔ علی گڑھ والوں کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملے گا پھر تم ہو، ایوب ہیں وغیرہ۔

کچھ ہی دن بعد مولانا بالاتفاق ناظم دینیات مقرر ہو گئے۔ پندرہ سال تک مولانا نے جس لطف و ہمدردی، وسیع النظری، انتظامی قابلیت اور عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اس منصب کے فرائض انجام دیے اس کی نظیر علی گڑھ کے محکمہ دینیات کی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا لیکن پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ خواہ کوئی بھی اور کیسا ہی موسم ہو، یونیورسٹی میں تعطیل ہو یا نہ ہو مسجد میں پڑھائی، اس میں حتی الوسع کبھی ناغہ نہیں کیا۔ دینیات کی لائبریری از سر نو مرتب کی، دینیات کے نصاب پر نظر ثانی کی۔ مسجد اور متعلقہ عمارات کو ستھرا اور دیکھنے کے لائق بنائے رکھا، جتنے دارالاقامے یونیورسٹی اور اسکول سے متعلق تھے ان میں نماز پڑھنے پڑھانے کا باضابطہ انتظام کیا۔ یونیورسٹی میں مذہبی و اخلاقی فضا پیدا کرنے میں انتہائے خلوص و تدبر سے کام لیا۔

---

[1] جدید املا کے مطابق سلسلے کہا جائے گا۔

مولانا کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا پرایا بڑی خوش دلی اور مستعدی سے انجام دیتے تھے اور کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بعضوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنا یا دوسرے کا کام کریں گے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہیں گے۔ کبھی مصروفیت سے، کبھی ناسازی طبع سے، کبھی اپنے نقصان سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانے سے۔ پھر کر چکیں گے تو احسان منوانے یا اپنی اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو ادنیٰ سا کام کریں گے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے، لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طور پر کریں گے گویا کوئی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں یا ان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مرحوم اس کے بالکل برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا، وہ اس کو اس طور پر کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ غیر شعوری طور پر سانس لیتے ہیں بغیر کسی قسم کا اعلان کیے اور بغیر کسی معاوضہ کی توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دیتے بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

شعبہ فنون کے ایک طالب علم نے ''اکیڈمک کونسل'' سے ایک بار ایسے مضامین اختیار کرنے کی اجازت چاہی جو مقررہ اوقات تعلیمی میں مخل ہوتے تھے۔ کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اراکین نہ تو یہ چاہتے تھے کہ ٹائم ٹیبل کی دقتوں میں اضافہ ہو اور نہ اس طالبعلم کی درخواست کو اسی بنا پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے جب کافی بحث ہو چکی تو مولانا نے فرمایا: کونسل اجازت دے دے جس مضمون کی تعلیم کی گنجائش نظام اوقات میں نہیں نکلتی وہ مرحوم کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھائیں گے چنانچہ اس طالب علم کو مولانا نے دو سال تک مسلسل انتہائی پابندی و انہماک سے اپنی فرصت کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے عملے میں مولانا کو بعض بڑے نالائقوں سے بھی سابقہ ہوا لیکن وہ ان سے اس طور پر نباہ کرتے تھے کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی۔ موذنوں اور پیش اماموں کی بڑی خبر گیری کرتے تھے، ان سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ ان سبھوں کو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ مولانا ان کے افسر تھے، ان کے کاموں میں کبھی کوئی عیب یا نقص نہ نکالا، ان کی ذاتی دقتوں کو اپنا لیتے۔ مولانا کے سپرد جو انتظامات تھے ان کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولانا کسی قسم کے تردد یا دوادوش میں مبتلا ہوئے ہوں۔

کمیٹیاں ہورہی ہوں، کاغذی گھوڑے دوڑائے جارہے ہوں اور ایک ہنگامہ برپا ہو، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولانا کی منشا خود بخود ہر جگہ پوری ہورہی ہے، اور مولانا کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنے والا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیقہ اور محنت سے ادا کررہا ہے۔

اسی طرح دینیات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے ازسرنو ترتیب دیا۔ کتابوں کے انتخاب میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ علوم اسلامیہ پر جو کتابیں بیرون ہندوستان شائع ہوتیں مولانا کی ان پر خاص نظر ہوتی۔ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کون سی کتاب کہاں شائع ہوئی اکثر پوچھتے رہتے کس یورپین مستشرق نے اسلامی ادب، شاعری یا اس قبیل کے کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ مرحوم کو ان کتابوں سے خاص دلچسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اردو میں شائع ہوئیں۔

اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی زبان تو اردو ہوتی جارہی ہے۔ کیونکہ براہ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں جو تحقیقاتِ علمیہ کا کام کرتے ہیں ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اردو ہی کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ مولانا کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان تمام اردو کتابوں کو دینیات کی لائبریری میں جگہ دیتے تھے جو فلسفہ، مذہب، اخلاقیات یا اس قسم کے دوسرے مباحث پر یورپین زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں۔ فرماتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یونانی کتب کے ترجمہ سے اسلامی تصورات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا۔ اس سے کہیں دوررس نتائج موجودہ عہد میں پیش آنے والے ہیں کیونکہ فلسفہ کی ترقی، سائنس کے انکشافات، مطبوعات کی اشاعت، ملنے ملانے کی سہولتیں، عوام وخواص دونوں کے ذہن وافکار کو بڑی سرعت اور شدت سے متاثر کررہی ہیں۔ اس لیے ان مطبوعات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے بے آب وگیاہ بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت، نہ وہاں پہنچنے کا ڈھنگ کا کوئی راستہ، نہ نماز جنازہ پڑھنے کی کوئی ستھری معقول جگہ، نہ محافظ قبرستان کے رہنے سہنے کا کوئی انتظام، نہ میت کے لے جانے کے لیے کوئی تابوت۔ اس طور پر یونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضوخانہ نہ تھا لوگ حوض کے گرد بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک ومحفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میت کو غسل دینے اور کفنانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مولانا نے نہایت خاموشی اور مستعدی کے ساتھ رفتہ رفتہ انتظام کردیا۔

مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتفاق سے بھی کسی صحبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اجنبی مخل صحبت ہوا ہے۔ یونیورسٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخصوص حلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے۔ کوئی پھکڑ ہے، کوئی سنجیدہ۔ کسی کو سیاسی مسئلہ سے دلچسپی ہے تو کسی کو مذہبی باتوں سے تسکین ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویہ سے دیکھتا ہے، کوئی کسی زاویہ سے۔ کوئی کچھ ہے، کوئی کچھ، یہ بھی ظاہر ہے کہ مرحوم یونیورسٹی کے ناظم دینیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے اس کے کردار، گفتار متعین ہوتے تھے۔ بااین ہمہ یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور بشاش ہو جاتے تھے۔ گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا اور لوگ آرزو کرتے کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔ مرحوم کی سیرت و شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے اور نہ دوسرا متجاوز ہو سکتا تھا۔ مرحوم کو خدا نے ایسا متوازن دل و دماغ دیا تھا، اور ان کی شخصیت اتنی دلآویز تھی کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

(گنج ہائے گراں مایہ)

سوالات

-1 مختصر جواب دیجیے:

-i مولانا ابوبکر کتنے سال ناظم دینیات رہے؟

-ii مولانا کا بڑا وصف کیا تھا؟

-iii مولانا ابوبکر کس نوع کی کتابوں کو پسند کرتے تھے؟

-iv مصنف کے نزدیک مولانا کی سب سے بڑی خوبی کیا تھی؟

-v مولانا ابوبکر کی محفل میں غیر متوقع آمد پر لوگوں کا ردعمل کیا ہوتا؟

-2 اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

-3 درج ذیل الفاظ کے معانی لکھیے اور انھیں جملوں میں استعمال کیجیے:

برگزیدگی، موہوم، التفات، مخلص، استمزاج، نووارد، مصالح، مضائقہ، عندیہ، نیوتہ، محاسن، منصب، نظیر، انہماک، مستشرق، بے آب وگیاہ، متجاوز۔

-4 اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

-i جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے تو معاً دل میں سوال پیدا ہوتا ہے یہ.........کا ہے یا نہیں؟

-ii پندرہ سولہ سال ہوئے یونیورسٹی میں ناظم.........کی جگہ خالی ہوئی۔

-iii ہر ملنے والے سے خواہ وہ اجنبی اور.........ہی کیوں نہ ہو مولانا کا یہی انداز.........تھا۔

-iv مصلحت پرستی.........کی جڑ ہے۔

-v میں تو صرف آپ کا.........لینا چاہتا تھا۔

-vi دینیات کی.........از سرِ نو مرتب کی۔

-vii یونیورسٹی میں مذہبی و.........فضا پیدا کرنے میں انتہائے خلوص و.........سے کام لیا۔

-5 سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"بااین ہمہ یہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور بشاش ہو جاتے تھے۔ گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہ آتا اور لوگ آرزو کرتے کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوں۔ مرحوم کی سیرت وشخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے حدود سے خود متجاوز ہوتے تھے اور نہ دوسرا متجاوز ہو سکتا تھا۔"

سفر نامہ

دور جدید میں اردو اصناف نثر میں سفر نامہ ایک امتیازی صنف کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ سفر نامے کی دلچسپی کا انحصار دو باتوں پر ہوتا ہے۔ سفر کے واقعات کی جدت اور انداز بیان کی تازگی، اردو کے قدیم سفر ناموں میں عجائبات فرنگ (یوسف کمبل پوش) ''مسافران لندن'' (سر سید احمد خان) ''سفر نامہ روم و مصر و شام'' (شبلی نعمانی) اہم ہیں۔ سفر نامہ ایک چشم دید بیانیہ ہوتا ہے جس کو سفر نامہ نگار قلبی واردات بنا کر ادبی اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ وقت کا دورانیہ سفر نامے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کم وقت میں ایک اجنبی سرزمین ایک سیاح پر وہ اسرار منکشف نہیں کر سکتی جو ایک اچھے سفر نامے کا مواد بن سکے۔ سفر نامہ کسی سفر کی روداد ہی نہیں ہوتا، ایک اچھے سفر نامہ نگار کو اجنبی سرزمین اور اپنے وطن کے کلچر کا حسن کاری کے ساتھ موازنہ بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔

بیگم اختر ریاض الدین کے دو مجموعے ''سات سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ محمود نظامی، ممتاز مفتی، ابنِ انشا، مستنصر حسین تارڑ، جمیل الدین عالی اور عطاالحق قاسمی کے سفر نامے بھی لائق مطالعہ ہیں۔ سفر نامہ نگار دورانِ سفر ڈائری کی مدد سے یا سفر کے بعد اپنی یادداشت کی مدد سے سفر نامے لکھتا ہے۔ سفر نامہ میں تخلیقی حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب علاقہ (کہ جس میں سفر نامہ نگار ایک سیاح کی طرح گھوما) اس کا کردار بن جائے۔

(۱۸۹۲ء۔۱۹۷۷ء)

عبدالماجد دریابادی

عبدالماجد دریابادی کا تعلق ایک معزز علمی خاندان سے تھا۔ انھوں نے لکھنؤ سے بی۔اے کیا۔آپ کوفلسفہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ جامع عثمانیہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں فلسفے کی کتابوں کے کافی عرصہ تک مترجم رہے۔ پھر لکھنو واپس آکر تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں ایک ہفت روزہ رسالہ ''سچ'' کے نام سے جاری کیا جو بعد میں ''صدق جدید'' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔آپ کی ایک کتاب ''نفسیات عوام'' انگلستان میں چھپی، دوسری اہم تصانیف میں فلسفہ جذبات' فلسفہ اجتماع' حکایات برکلے اور تاریخ اخلاق یورپ، ترجمے ہیں۔ سیرت محمد علی جوہر، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔آپ کا سب سے اہم کام اردو اور انگریزی میں ترجمہ قرآن ہے۔

جدہ۔ راہ مدینہ

صالح بسیونی نے ہمیں اپنے ذاتی مکان میں ٹھہرایا، یہاں کئی کئی منزلوں کے مکانوں کا رواج ہے۔ یہ مکان بھی کئی منزل کا ہے ہم لوگوں کو جگہ دوسری منزل میں ملی۔ اس میں دو کمرے ہیں، ایک بڑا اور ایک اوسط درجے کا، عورتوں کو بڑے کمرے میں کر دیا، چھوٹے کمرے کو مردانہ رکھا۔ سامان زیادہ تر نیچے کی منزل میں رہنے دیا، سولہ آدمیوں کے لیے دو کمروں کی گنجائش ناکافی معلوم ہو رہی ہے۔ صحن نہ ہونے سے گرمی علی الخصوص محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن یہ بھی درحقیقت اللہ کی ناشکری ہے، سینکڑوں ہزاروں اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جنھیں اتنی جگہ کیا معنی اس کی آدھی بلکہ چوتھائی بھی نصیب نہیں وہ صبر اور شکر کے ساتھ تیز دھوپ میں تپتی ہوئی زمین کے اوپر سڑکوں اور راستوں میں بستر جمائے بیٹھے ہیں، وہ بھی انسان ہیں، وہ بھی حاجی ہیں، وہ بھی پردیسی ہیں، وہ بھی اللہ کی راہ میں گھر بار، عزیزوں، دوستوں کو چھوڑ کر نکلے ہیں اور ان میں سب کے سب مُفلس اور کنگلے بھی نہیں، کیا انھیں آرام کی خواہش نہیں؟ کیا انھیں موسم کی سختیوں کا احساس نہیں ہوتا؟۔ جدہ کا رقبہ کچھ بہت بڑا نہیں۔ اس لیے مقامات زیادہ دور دور نہیں، جہاں ہم ٹھہرے ہیں، بازار یہاں سے قریب ہیں، ڈاکخانہ بھی زیادہ فاصلے پر نہیں اور مسجد تو بالکل پڑوس ہی میں ہے، اتفاق سے آج ہی ہندوستان کی ڈاک روانہ ہونے کا دن ہے۔ خطوط لکھ کر لیٹر بکس میں ڈالے نہیں گئے بلکہ پوسٹ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں دے دیے گئے۔

جدہ اترتے ہی سفر مدینہ کے لیے روپے کی ضرورت پڑی، عمر بھائی، چاند بھائی نے جدہ میں ہنڈیاں ایک ہی نام کے دو ساہوکاروں شیخ جمال الدین اور سیٹھ جمال الدین پٹنی کے نام دی تھیں۔ دونوں سے ملاقات ہوئی۔ اول الذکر نے بڑی مستعدی اور مستعدی سے بڑھ کر ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ سارا کام کر دیا۔ یہی نہیں کہ فوراً ادا کر دی بلکہ یہ صحیح و ضروری مشورہ دے کر کہ اندرون حجاز انگریزی نوٹ اور روپے سے کہیں بڑھ کر انگریزی گِنیاں کام دیتی ہیں، رقم کو نوٹ سے گنیوں میں تبدیل کر دیا، روپے ہاتھ میں آتے ہی چلنے کی فکر ہوئی جدہ اور مدینہ کے درمیان اونٹ کے قافلے بھی ہیں اور اب لاریاں بھی بکثرت چلنے لگی ہیں۔ ہم لوگوں نے لاری ہی پر چلنا

طے کیا، حجاز میں قدم رکھتے ہی مسافر بالکل معلم یا ان کے وکیل کے ہاتھ میں آجاتا ہے بغیر ان کی وساطت کے کسی سواری کے لیے معاملت نہیں کرسکتا۔ وکیل صاحبوں کے مصالح و اغراض قدرتاً اس کے مقتضی ہوتے ہیں کہ جتنے دن بھی ممکن ہو حاجیوں کو جدہ میں پڑا رہنے دیا جائے اور جب سواری کے لیے تقاضا کریں تو انھیں ٹال دیا جائے یہی صورت ہمارے ساتھ پیش آنی شروع ہوئی۔

۹، اپریل یک شنبہ۔ وکیل صاحب نے آج لاری دلانے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن یہ وعدہ اطمینان و اعتبار کے لیے کافی نہ تھا۔ اگر آج شام کو وہ انکار کر دیتے تو ان کا تو کوئی نقصان نہ ہوتا۔ لیکن ہم لوگوں کا ایک دن خواہ مخواہ ضائع ہو جاتا اور نہ صرف یہ کہ مدینہ طیبہ کی حاضری میں ایک دن کی تاخیر ہو جاتی بلکہ وہاں کی مُدتِ قیام میں بھی ایک دن گھٹ جاتا۔ وکیل صاحب کے لیے ہماری التجائیں اور درخواستیں قطعاً غیر موثر تھیں۔ آج صبح میں مولانا مناظر احسن صاحب کے ہمراہ شیخ عبدالرحمٰن محمد الفضل سے ملا جو بمبئی کے عبداللہ الفضل کے حقیقی بھائی ہیں اور جدہ کے مشاہیر اور سلطان کے حاشیہ نشینوں میں ہیں۔ یہ بہت خوب شخص نکلے۔ خلافت کمیٹی، علی برادران، خدام الحرمین اور ہندوستان کے اور بہت سے مسائل پر آزادی و بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے، شرکۃ الحرمین کے نام سے ایک موٹر کمپنی انھیں کی ہے۔ سفرِ مدینہ کی عجلت ہم لوگوں میں دیکھ کر انھوں نے پورا اطمینان دلایا کہ وکیل کو تاکید کر کے آج ہی لاری کا انتظام کر دیا جائے گا اور شام تک قافلہ روانہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد وکیل صاحب کو بھی کوئی راہ گریز باقی نہ رہی اور آج شام کو روانگی طے پا گئی۔ لاری کی سرکاری شرح آمد و رفت فی کس پندرہ گنی تھی، لیکن مختلف موٹر کمپنیوں میں مقابلہ جاری تھا۔ اس لیے ارزانی ہو کر فی کس دس گنی تقریباً (۱۳۵ روپیا انگریزی) کی شرح آمد و رفت رہ گئی تھی۔ مولوی شاہ لطیف اللہ صاحب مونگیری کی پانچ آدمیوں کی پارٹی بھی ہمارے ہی ہمراہ چلنے پر آمادہ ہوئی، اس طرح کل ۲۱ آدمی ہوئے۔ دو موٹر لاریاں تیرہ تیرہ نشستوں کی کی گئیں اور الفضل صاحب کی عنایت سے ہمارے لیے مخصوص ہو گئیں، یعنی ۲۱ آدمیوں کے ٹکٹ سے ۲۶ آدمیوں کی جگہ مل گئی۔

موٹریں روانہ ہوئیں اور شب کی تاریکیوں میں سفر شروع ہوا، کس کا سفر کہاں کا شروع ہوا؟۔۔۔کون بتائے؟ کس کی زبان جواب دے؟ حاضری کی اجازت اسے مرحمت ہو رہی ہے، جس کے نامہ اعمال کی سیاہیاں شاید شب تار کی تاریکیوں سے بھی سیاہ تر ہیں۔ حضوری اس کے آستانے پر ہو رہی ہے جو الطارق بن کر رات کی تاریکیوں کو منور کرنے آیا جس کا ظہور اس گھڑی ہوا

جب دنیا پر تاریکیوں اور سیاہیوں کے ایک سے ایک گہرے پردے پڑے ہوئے تھے اور جو اپنے ہمراہ نور اور اجالا لے کر آیا۔۔۔ایں! یہ دل کیوں دھڑکتا جاتا ہے؟ یہ آنکھیں کیوں پُرنم ہو رہی ہیں؟ یہ زبان کیوں خشک ہوئی چلی جاتی ہے؟ سامنا اس کا تو نہیں جو محض حاکم و آمر ہے، شارع و داعی ہے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے والا ہے۔ حاضری تو اس کے دربار کی ہے جو ہمہ رحمت و ہمہ مرحمت ہے، جو بدکاروں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے، جس کا نام شفیع المذنبین ہے۔ یعنی نیکوں اور پاکیوں کا نہیں۔ گناہگاروں کا نجات دلانے والا، تباہ کاروں کا سہارا! یہ سب کچھ سہی یہ سب صحیح، پر وہ دل اب بھی اپنے قابو میں نہیں۔ نفس کی شرارتیں، اندر کی خباثتیں قلب کی قساوتیں ایک ایک کر کے بے پردہ بے نقاب سامنے آ رہی ہیں اور ریا و نفاق کا جامہ ہر ہر لحہ چاک ہو رہا ہے، جدہ سے نکلتے ہی ریت شروع ہو جاتی ہے راستا کا بیشتر حصہ بالکل ریتلا ہے اور جب مدینہ طیبہ کی مسافت بقدر ایک ثلث رہ جاتی ہے تو پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور زمین بالکل پتھریلی ملنے لگتی ہے، ان ناہمواریوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ لاریاں گویا اچھلتی ہوئی چلتی ہیں اور دھکے دھچکے قدم قدم پر لگتے رہتے ہیں، ادھر دھچکا لگا اور ادھر زبان اعتراض پر کھلی!۔۔۔اے ریاکار! آج تیری اصلیت ظاہر ہو گئی ہے! اے ظاہر دار اس وقت تیری کنچلی اتر رہی ہے، جب قوالی کی محفلوں میں یا شاعری کی دنیا میں ”دشت یثرب میں ناقہ کے پیچھے دوڑتے رہنے“ کا یا تلووں میں خار صحرائے مدینہ کے چبھنے“ کا ذکر آتا تھا، تو خوب گردن ہلا ہلا کر جھومتا تھا، جوش و مستی کا اظہار کرتا تھا اور ہمہ تن اشتیاق و تمنا بن بن جاتا تھا، پھر آج تو یہ منظر سامنے ہے تصور و خیال میں نہیں، مادی آنکھوں کے روبرو ہے۔ اس خاک کا سرمہ آنکھوں میں کیوں نہیں لگاتا؟ یہاں کے کانٹوں کو اپنے پیروں میں کیوں نہیں چبھنے دیتا؟ اس دشت میں جیب و گریباں کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کیوں نہیں دوڑ لگاتا؟ محبت رسولؐ کے دعوے زبانی تھے، دوستوں اور معتقدوں کے مجمع میں عشق سرکار مدینہؐ کی خوب خوب لاف زنی ہوتی تھی آج سارے دعووں کی حقیقت کھل گئی، مرکز نور سے جوں جوں قرب حاصل ہوتا جاتا ہے، ہر شے کی اصلیت سے نقاب اٹھتا جا رہا ہے۔ اے نفس کے غلام! کیا تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ تیری ریاکاری اور ظاہرداریوں پر پردہ یوں ہی پڑا رہنے دیا جائے گا؟

ہماری طرح خدا معلوم کتنی اور موٹریں اور لاریاں سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی اسی راستے

پر چل رہی ہیں۔ ہزار ہا انسان اونٹوں کے قافلوں میں چلتے ہوئے مل رہے ہیں، سیکڑوں آدمی پیدل سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی، بوڑھے بھی ہیں اور بچے بھی، غریب بھی ہیں اور امیر بھی، بنگالی بھی ہیں اور پنجابی بھی، دکھنی بھی ہیں اور گجراتی بھی حجازی بھی ہیں اور نجدی بھی، مصری بھی ہیں اور سوڈانی بھی، جاوی بھی ہیں اور چینی بھی، برمی بھی ہیں اور بخاری بھی، افغانی بھی ہیں اور مراقشی بھی، یہ سب کے سب وطن اور عزیزان وطن کو چھوڑے ہوئے، تپتی ہوئی ریگ میں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کشمیر اور شملہ کو چھوڑ کر سبزہ زاروں اور آبشاروں کو بھلا کر، بھوک اور پیاس کی مشقتیں جھیلتے ہوئے اور گرد و غبار میں غسل کرتے ہوئے کہاں کو چل رہے ہیں؟ رام پور کے حاتم وقت رئیس کلب علی خاں کو کس راستے کی خاک پھانکنے پر فخر تھا؟ بھوپال کی اہل دل فرماں روا سلطان جہاں بیگم کو کس کے آستانے کی گدائی پر ناز رہا ہے! مملکت آصفیہ کے تاجدار میر عثمان علی خاں نامدار کے دل کو آج بھی کس کے کوچہ کی آرزوئے جاروب کشی تڑپائے ہوئے ہے؟ محمدؐ کے نام سے ابوجہل اور ابولہب کی طرح جلنے والے محمدؐ کی عظمت کو "علمی" توجیہات و تاویلات کو مسخ کر کر کے دلوں سے گھٹانے والے' محمدؐ کی سیرت پاک کو اپنی ناپاکیوں اور گندگیوں پر قیاس کر کے پیش کرنے والے آج کاش اپنے اپنے مٹی کے گھروندوں سے باہر نکل کر دیکھیں کہ اس دریا جو جیت، اس غلبہ دجالیت کے باوجود دنیا کی کسی یونیورسٹی اور کسی کالج میں کسی جامعہ اور کسی اکیڈیمی میں، کسی کتب خانہ اور کسی تجربہ گاہ میں کسی ماہر فن" کے لیکچر روم میں کسی پروفیسر کے حلقہ درس میں، وہ کشش اور دلکشی وہ قوت جذب ہے جو اس مقام میں ہے جہاں اس اُمی کا جسد ظاہری آرام فرما رہا ہے جو اپنے رب کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا (احمدؐ) تھا اور جس کو اس کے رب نے "تعریف کیا گیا" (محمدؐ) کہہ کر پکارا؟۔

(سفرِ حجاز)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- مصنف نے اپنی رہائش گاہ کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں؟

ii- مصنف نے وکیل صاحبوں کے کس رویے کی نشان دہی کی ہے؟

iii- عبدالرحمٰن محمد الفضل نے مصنف اور ان کے ساتھیوں کے لیے کیا سہولت بہم پہنچائی؟

-iv مصنف کے مطابق جدہ اور مدینے کے درمیان راستے کی کیا کیفیت تھی؟

-v مدینے کے قریب پہنچ کر مصنف کو اپنی کن کمزوریوں کا احساس ہوا؟

-vi مصنف رسول اکرمؐ کو اپنی ذات پر قیاس کرنے والے مغربی مصنفوں کو کس بات کی دعوت دیتا ہے۔

-vii سفرنامے کے اس باب میں مصنف نے اپنے کن رفیق سفر کا بار بار تذکرہ کیا ہے؟

-2 ہر سوال کے آخر میں چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں، درست جواب پر ''✓'' کا نشان لگائیے۔

-i .... کا رقبہ کچھ بہت بڑا نہیں۔

ا۔ جدہ ب۔ ریاض ج۔ طائف د۔ مدینہ

-ii .... کے لیے ہماری التجائیں اور درخواستیں قطعاً غیر مؤثر تھیں۔

ا۔ منتظم ب۔ ڈائریکٹر ج۔ وکیل د۔ افسر

-iii لاری کی سرکاری شرح آمدورفت فی کس .... گنی تھی۔

ا۔ پندرہ ب۔ سترہ ج۔ انیس د۔ پچیس

-iv .... کے حاتم وقت رئیس کلب علی خاں کو کس راستے کی خاک چھاننے پر فخر تھا؟

ا۔ رام پور ب۔ لکھنؤ ج۔ حیدرآباد د۔ دلی

-v اتفاق سے آج ہی .... کی ڈاک کے ڈاک روانہ ہونے کا دن ہے۔

ا۔ ہندوستان ب۔ افریقہ ج۔ شام د۔ مصر

-3 اس سبق کا خلاصہ لکھیے:

-4 سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

''حضوری اس کے آستانے پر ہو رہی ہے جو الطارق بن کر رات کی تاریکیوں کو منور کرنے آیا جس کا ظہور اس گھڑی ہوا جب دنیا پر تاریکیوں اور سیاہیوں کے ایک سے ایک گہرے پردے پڑے ہوئے تھے اور جو اپنے ہمراہ نور اور اجالا لے کر آیا۔''

(۱۸۸۴ء - ۱۹۵۳ء)

سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ندوی ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پھلواری میں حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلوم (لکھنؤ) میں داخلہ لیا اور علامہ شبلی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ کی علمی وجاہت نے آپ کے اساتذہ کو بہت متاثر کیا اور آپ ندوہ کے اساتذہ میں شامل کر لیے گئے۔ علم کلام اور عربی کی تدریس کے فرائض آپ کو سونپے گئے، جنھیں آپ نے بطریقِ احسن انجام دیا۔ پھر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا جو تمام عمر جاری رہا۔

۱۹۱۰ء میں آپ نے ''دارالمصنفین'' کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۶ء میں ایک علمی ماہنامہ ''معارف'' کے نام سے جاری کیا۔ سیرۃ النبیؐ کی تدوین و تکمیل اور حیات شبلی کی تالیف کے علاوہ بھی آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جن میں اہم تصنیف عربی الفاظ کی جدید لغت ہے۔ تاریخ ارض القرآن، رسالہ اہل سُنت، سیرۃ النبیؐ، خلافت عثمانیہ، اسلام خلافت اور ہندوستان، خطباتِ مدراس، رسولِ رحمتؐ، عمر خیام، نقوشِ سلیمانی، رحمت عالمؐ اور سیر افغانستان بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

غزنین کا سفر

تیس اکتوبر ۱۹۳۳ء کی صبح کو جب بیدار ہوا تو اس خیال سے خوشی ہو رہی تھی کہ آج اس ''غزنین'' کو دیکھوں گا جس کا نام قلم سے سینکڑوں دفعہ لکھا، زبان سے ہزاروں دفعہ لیا اور آنکھوں سے لاکھوں دفعہ پڑھا، غزنین سلطان محمود کا غزنی جس کا نام کبھی دنیا میں رعب و ہیبت بٹھاتا جس کے آستانے پر اربابِ کمال کا ہجوم رہتا تھا جس نے صدیوں دنیائے اسلام کی رہنمائی اور ہندوستان پر فرمانروائی کی۔ عنصری، فرخی، فردوسی اور سنائی[1] کا غزنین جس نے ہمارے ادبیات کی دنیا میں غیر فانی شہرت حاصل کی اور جس کی سیاسی تاریخ مورخین عالم کی تحقیقات کا مدت سے موضوع بحث ہے۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فراغت کی بندھے ہوئے اسباب کو دیکھا بھالا رخصت کرنے والے احباب سے بار بار مصافحے ہوئے اور چند روز کے اس قیام کی یاد کے وعدے ہوئے۔

عموماً دستور ہے اور یورپ میں یہ دستور قانون کی حد تک ہے کہ ہوٹل سے نکلتے یا کسی اقامت گاہ میں تو پہلے خدام کو ٹپ (بخشش) دیجیے حتیٰ کہ چائے خانے اور ریستوران میں بھی اس ''اخلاقی قانون'' کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی یہی چیز ٹرکی میں ''بخشیش'' کہلاتی ہے یورپ والے جب پرانی ٹرکی کا سفر کرتے تھے تو اس بخشیش کے مطالبے کو بہت بُرے اور ذلیل رنگ میں پیش کرتے تھے لیکن اُن کو اپنے ملک کا ٹپ برا نہیں معلوم ہوتا اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ''بخشیش'' مشرقی مسکنت اور نرمی کے لہجے میں مانگی جاتی ہے اور درازی عمر وغیرہ کی مسلسل دعاؤں کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اور ''ٹپ'' یورپین خشکی کے ساتھ وصول کی جاتی ہے اور سر کو ذرا سی جنبش دے کر اور ''تھینک یو'' کہ کر اس کی قیمت فوراً ادا کر دی جاتی ہے۔

مہمانوں نے طے کیا تھا کہ اس سرکاری مہمان خانے کے خدام کو جنھوں نے ہماری مہمانی کے فرائضِ متعلقہ بہت خوبی سے انجام دیے تھے سو روپے انعام میں دیے جائیں لیکن چلتے وقت جب یہ رقم ان کو بطور انعام دی جانے لگی تو انھوں نے بہت خوشی سے اس انعام کے قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ انھوں نے اپنے مہمانوں کا واجب فرض انجام دیا ہے جس کے لیے وہ کسی انعام کے مستحق نہیں ہیں ان کے اس فیصلے سے بڑا تعجب ہوا اور ان کی اخلاقی بڑائی کا سکہ مہمانوں کے

---

[1] فارسی شعرا کے نام

دلوں پر بیٹھا۔

یہ خدام نہایت ہوشیار نہایت باادب اور باسلیقہ اور خاموش طبع تھے اتنے دنوں میں ایک دفعہ بھی اُن کے شور وغل کی کوئی آواز کانوں میں نہیں آئی۔ چائے، کھانا، بستروں کی درستی اور کمروں کی صفائی وغیرہ کے تمام کام وہ نہایت خوبی اور خاموشی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ ان کی وضع یہ تھی سیاہ پتلون، سیاہ کوٹ سپید قمیض۔ پاؤں میں بوٹ اور سروں پر بالوں کی افغانی ٹوپیاں۔

حکومت نے اپنے مہمانوں کے بآرام سفر کا اہتمام بڑی خوبی سے کیا، کل مملکت افغانستان میں سفر کی پرانی منزلیں دس بارہ میل پر ہوتی تھیں ہر منزل پر حکومت کی طرف سے ڈاک بنگلے یا سرکاری اقامت خانے بنے ہوئے ہیں جس میں قیام کے ہر قسم کے سامان واسباب مہیا ہوتے ہیں، اب موٹروں کی تیز رفتاری نے اس منزل کو دور تر کردیا، اب یہ بنگلے اسی اور سو میل کے بعد آتے ہیں۔

حکومت نے مہمانوں کے قیام وانتظام کے لیے متوقع قیام گاہوں میں اطلاعی احکام بھیج دیے تھے اور نگران کار اور میزبان کی حیثیت سے سرور خاں گویا کو متعیّن کیا تھا کہ وہ مہمانوں کے ساتھ حکومت افغانستان کی آخری سرحد تک جائیں اور وہاں پہنچا کر واپس آئیں۔

سواری اور باربرداری کے لیے حکومت نے دو عمدہ موٹروں اور دو لاریوں کا انتظام کیا تھا ایک موٹر پر خاکسار، ڈاکٹر اقبال اور بیرسٹر غلام رسول اور دوسرے پر سر راس مسعود پروفیسر ہادی، جناب سرور خان گویا اور عبدالمجید صاحب نمائندہ سفارت خانہ افغانستان، دہلی سوار ہوئے، ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے والے اور کھانا کھلانے والے ملازمین کے لیے تھی اور دوسری لاری پر مہمانوں کا سامان واسباب تھا ساتھ ہی حکومت نے مہمانوں کے فوجی اعزاز اور حفاظت کی غرض سے دس بارہ سپاہیوں کا دستہ ساتھ کردیا تھا، وہ بھی انھیں لاریوں پر سوار تھے اس دستہ کا افسر جس کو غند مشر[1] کہتے ہیں جو جلال آباد کے پاس گردیز کے سادات میں سے تھا (نام بھول گیا) افسر مذکور بھی ہمارے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ پر شوفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ہم لوگوں کی روانگی میں ملنے ملانے کے باعث کچھ تاخیر ہو رہی تھی اس لیے لاریوں کو آگے روانہ کردیا گیا، آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ بھی روانہ ہوگئے،

کابل سے غزنین ۸۲ میل ہے موٹریں دشت وجبل اور نشیب وفراز کو لمحہ بہ لمحہ طے کرتی ہوئی اور خاک اڑاتی ہوئی رواں تھیں راستہ بہت حد تک صاف تھا سڑکیں عموماً اچھی حالت میں تھیں

---

[1] گروہ یا دستے کا سردار، یہ پشتو زبان کا لفظ ہے۔

زمین زیادہ تر ہموار تھی دُور دُور پہاڑ بھی نظر آتے تھے اور ان کے دامنوں میں وسیع میدان اور وادیاں پھیلی تھیں، ان وادیوں میں پہاڑی چشمے بہ رہے تھے جن کے سبب سے یہ وادیاں موسم بہار میں سرسبز ہو جاتی ہیں اور کاشت کے کام میں آتی ہیں یہ تمام زمین قابل زراعت تھی اور خوشی کی بات ہے کہ افغان کاشت کار اس میں پوری محنت سے کھیتی کرتے ہیں کابل سے لے کر غزنین تک کھیتوں کا یہ سلسلہ برابر ملتا چلا گیا مگر اس وقت کسی کھیت میں بھی کوئی چیز بوئی ہوئی نہ تھی یہاں کی کاشت کا زمانہ گرمیوں میں آتا ہے جب برف پگھل کر زمین کو شاداب کرتی ہے۔

یہاں گاؤں کی آبادی کا اصول یہ ہے کہ چشمے جدھر جدھر مڑتے ہوئے بہتے ہیں ان ہی کے قریب تھوڑی تھوڑی دور پر گاؤں آباد ہوتے ہیں۔ پھر قدرتی اسباب سے یہ چشمے بھی خشک یا بند ہو جاتے ہیں تو یہ گاؤں بھی مٹ جاتے ہیں اور دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نظر آیا کہ چشمے نے گاؤں کی ایک سمت سے دوسری سمت رخ کر لیا تو گاؤں کی آبادی نے اِدھر سے اپنے جھونپڑے اٹھا کر اُدھر ڈال دیے۔ دیواریں مٹی کی اور چھتیں بھی عموماً مٹی کی ہوتی ہیں اور بارش کی کمی کے سبب سے یہ چھتیں یہاں مستحکم رہتی ہیں۔

چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا غیر منقطع سلسلہ نظر کے سامنے تھا ان پہاڑیوں کے سبب سے کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگے راستہ بند ہے اور ان پہاڑیوں پر چڑھ کر جانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہوگا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے راستہ وادیوں میں گھوم گھوم کر بہت صاف نکلتا آتا تھا۔

پشاور اور کابل کے درمیان جو پہاڑی راستہ ہے اُس کے بالمقابل ہم اس راستے کو نہایت صاف میدانی راستہ کہہ سکتے ہیں، کہیں کہیں بیچ میں نشیب تھا اور اس کی دونوں طرف کی زمینیں بلند تھیں ایسے موقعوں پر عموماً پل بندھے تھے لیکن ایسے مقامات بھی آئے جہاں پل سرے سے نہ تھے یا ٹوٹ گئے تھے بظاہر مشکل نظر آتا تھا کہ اس اتار چڑھاؤ کو موٹریں کیسے طے کر سکیں گی ان افغانی شوفروں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ وہ اس آسانی سے موٹروں کو اتار اور چڑھا لیتے تھے کہ ہم کو ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔

راستے میں ایک دو پہاڑیاں ایسی بھی آئیں کہ جن کے اوپر ہمارے رفیق فوجی افسر نے بتایا کہ افغانی قلعے ہیں اور ان میں سرکاری فوج رہتی ہے۔

راہ میں لاریاں مل رہی تھیں جن پر تجارتی سامان آ جا رہا تھا، پرانے قافلہ کے اونٹ اور

گدھے بھی بوجھ سے لدے ہوئے آجا رہے تھے خانہ بدوش قبیلے اور خاندان جن میں عورت، مرد اور بچے سب تھے پا پیادہ اور گدھوں پر سوار ملتے جاتے تھے ان کے ساتھ ساتھ ان کے رفیق کتے بھی ہوتے تھے کبھی کبھی گدھوں کے اوپر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں جو عجیب دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔

اب دو پہر کا وقت تھا مگر دھوپ میں حدت نام کو نہ تھی بلکہ کافی سردی تھی سردی کے پورے لباس پہننے کے باوجود موٹر کی شیشے کی کھڑکیاں اٹھالی تھیں کہ ہوا اور غبار سے حفاظت رہے۔

(سیرِ افغانستان)

سوالات

-1 مختصر جواب دیجیے:

-i غزنی کس شخصیت کے حوالے سے مشہور ہے؟

-ii ٹرکی میں ٹپ کو کیا کہتے ہیں؟

-iii مہمانوں نے کیا طے کیا تھا؟

-iv مصنف نے خدام کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں؟

-v حکومت نے مہمانوں کے لیے کیا اہتمام کیا؟

-vi مصنف نے کابل سے غزنین کے درمیان علاقے کی کیا خوبیاں بیان کی ہیں؟

-2 مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

خاموش طبع، وضع، باربرداری، نشیب وفراز، غیر منقطع، پاپیادہ، رفیق، حدّت، خانہ بدوش، مستحکم، تعجب، ارباب کمال۔

-3 اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

-i یہ .... نہایت ہوشیار نہایت باادب، باسلیقہ اور خاموش طبع تھے۔

-ii .... نے اپنے مہمانوں کے بآرام سفر کا اہتمام بڑی .... سے کیا۔

-iii کابل سے غزنین .... میل ہے۔

-iv چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا .... سلسلہ نظر کے سامنے تھا۔

-v کہیں کہیں بیچ میں .... تھا اور اس کی دونوں طرف کی زمینیں .... تھیں۔

-4 سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

”حکومت نے اپنے مہمانوں کے بآرام سفر کا اہتمام بڑی خوبی سے کیا، کل مملکت افغانستان میں سفر کی پرانی منزلیں دس بارہ میل پر ہوتی تھیں ہر منزل پر حکومت کی طرف سے ڈاک بنگلے یا سرکاری اقامت خانے بنے ہوئے ہیں جس میں قیام کے ہر قسم کے سامان واسباب مہیا ہوتے ہیں، اب موٹروں کی تیز رفتاری نے اس منزل کو دور تر کر دیا، اب یہ بنگلے اسی اور سو میل کے بعد آتے ہیں۔“

(ولادت:۱۹۳۶ء)

بیگم اختر ریاض الدین

اختر ریاض الدین نے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور پھر تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔کچھ مدت پڑھاتی رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو میں مضمون لکھنے کا شوق بھی انھوں نے برابر جاری رکھا۔ان کے انگریزی مضامین پاکستان ٹائمز میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔سفرنامے ملک کے بلند پایہ جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ایک سفرنامے کا نام ''سات سمندر پار'' ہے اور دوسرے کا ''دھنک پر قدم'' ان دونوں سفرناموں میں مشرق اور مغرب کے مختلف ملکوں کی معاشرت اور تہذیب کے متعلق اتنی دلچسپ اور متنوع باتیں ملتی ہیں کہ آدمی گھر بیٹھے دنیا کے ان مختلف ممالک کی سیر کر لیتا ہے۔''دھنک پر قدم'' پر انھیں آدم جی انعام بھی مل چکا ہے۔

اختر ریاض الدین میں جرات اظہار ہے۔وہ جس چیز کو جس رنگ میں دیکھتی ہیں۔اسی صورت میں پیش کرتی ہیں،کوئی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔انھوں نے اچھی چیزوں کو اچھا کہنے اور بری چیزوں کو برا کہنے میں ہمیشہ حق گوئی سے کام لیا ہے۔ان کی تحریر کی نمایاں خوبیاں یہ ہیں،منظر نگاری،محاکمہ،حکیمانہ نکتہ وری، کفایتِ لفظی اور نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال۔

قاہرہ

ہمارا جہاز نہر سویز میں آہستہ آہستہ ایک عجب بے اعتنائی کے ساتھ داخل ہوا ہم سب باہر ڈیک پر نکل آئے اور مختلف خیالات میں ڈوب گئے، سب زیادہ تر خاموش تھے اور اپنی یادوں سے ہم کلام۔ ''فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔'' کوئی سویز کی تاریخ میں گم تھا۔کوئی قاہرہ کی شبانہ رنگینیوں کے پروگرام میں، کوئی فہرست خرید و فروخت میں تو کوئی اُبھرتے ہوئے چاند کے رُومان میں، میں اکیلی کھڑی موجوں کی تنظیم کو دیکھ رہی تھی۔ کس ضبط کس فراخدلی سے ہماری اطالوی حویلی کو کوراستا ریتی جارہی تھیں۔سوئیز کسی بھی سیاسی طاقت یا گروہ کے قبضے میں ہو اقوامِ متحدہ کی اسمبلی میں اس پر کتنے طویل مباحثے ہوں، دنیا کا امن چاہے اس کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے لیکن اس کے پانی غیر جانب دار ہیں۔ ہر مہمان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہر ایک سے یکساں سلوک روا رکھتے ہیں۔ کتنی للچائی نظریں اس پر ماضی نے ڈالیں یہ ہمیں معلوم! کیسی کیسی ناگہانی آفتیں اس پر آنے والی ہیں یہ خدا کو معلوم! لیکن یہ نیلگوں شاہراہ! یہ مغرب و مشرق کی معاشی شاہ رگ اپنی فطری معصومیت میں رواں ہے۔ تاریخی جرائم سے بے خبر۔ موجودہ دھمکیوں سے نابلد اس امن وسکون جو ازل تھا اور ابد جدا نہیں، بہتی جارہی ہے۔ شام ایک ریشم زبان سیاست دان کی طرح آہستہ آہستہ روشنی کی جڑیں کاٹتی ہوئی آرام سے کائنات پر غالب آگئی۔ شفق کے کچے رنگ پانی میں گھل کر پھیل گئے، لہروں کی پھوار میں آدھی فاختاؤں کے غوطے! ہر طرف سفید سفید جھاگ! معلوم ہوتا تھا زیرِ آب ہزاروں گوالنیں دودھ بلو بلو کر اُچھال رہی ہیں۔ پورٹ سعید قریب تر ہونے لگی۔ ننھی ننھی روشنیوں کی قطاریں دور ساحل پر جیسے جل پریوں کی سرحدِ آب پر درخشاں حباب آویزاں ہوں۔

جہاز نے لنگر ڈال دیے۔ رات بے تابی سے کٹی۔ کل صبح قاہرہ کی سیر! جہاز والوں نے بارہ گھنٹے کا پورا پورا استعمال بتا کر ۷۵ روپے وصول کر لیے تھے۔ صبح کاذب سے اُٹھ کر تیار ہوئے میلی میلی کشتیوں میں بیٹھ کر گدلے گدلے پانی پر گزرتے ہوئے مصری سرزمین پر قدم رکھا جہاز کی حدود بندی کے بعد زمین کی فراخی بہت بھائی۔

پورٹ سعید سے قاہرہ کافی دور ہے۔ ہماری بس اڑھائی گھنٹے میں قاہرہ پہنچی، قاہرہ کے بازاروں میں سے گزرتے ہوئے ہماری ٹورسٹ بس نے ایک بڑے ہوٹل میں اتار دیا۔ ہاتھ منہ

دھو کر ہم اپنے مقررہ تاریخی مقامات دیکھنے روانہ ہوئے۔ قاہرہ قدیم و جدید تہذیب کی ایک کھچڑی ہے۔ اُس کی عمر چار ہزار سال قبل از مسیح بتائی جاتی ہے۔ جدید ترین ہوٹل، عیش کدے، تھیٹر، اسے مشرق وسطیٰ کا ماڈرن پیرس بھی کہتے ہیں اور قدامت کا گہوارہ بھی۔ وہ نقشہ جو عموماً اسلامی مُمالک میں ہے یہاں پر بھی ہے، ایک طرف بدو اور اُونٹ، دُوسری طرف کیڈلک اور بیوک۔ ادھر پھٹے حال ننگے پیر بچے، اُدھر موٹی چکنی امیر عورتیں پنسل ہیلوں کے ساتھ اپنی شاپنگ میں مصروف ہماری بس دریائے نیل پر جا کر رُکی۔ دریائے نیل تاریخ کی سیر گاہ مصر کی رگِ زراعت۔ یہ مورخوں کا تخیل اور شاعروں کا خواب! کیا یہ دریائے نیل ہے؟ ایک چھوٹی سی گدلی[1] نہر جس کے ایک طرف مخملیں محفلیں اور نقرئی قہقے، دوسری طرف سنسان غربت۔ یہ حقیر نالہ تاریخی نیل کا مضحکہ لگ رہا تھا۔ اس کے سارے ڈرامے ماضی پر ایک تمثیلچہ! شاید کتابوں میں چیزیں بڑی اور شاندار معلوم ہوتی ہیں۔ مورخ کا زورِ قلم ان کا رقبہ دوگنا کر دیتا ہے، لیکن ہم نے تو سنا تھا کہ دُور سے چیز چھوٹی معلوم ہوتی ہے یہاں قریب آ کر اور چھوٹی معلوم ہوئی۔ یہ دریا جس کے ایک کنارے پر مغربی موسیقی کے لپٹے اُٹھ رہے تھے اور مغربی لباس، مغربی آداب میں نے آنکھیں دوبارہ ملیں۔ کیا یہی دریائے نیل ہے کہیں صدیوں کا مغالطہ تو نہیں ہو گیا!

SPHINX[2] کے قریب گئے۔ سر عورت کا چہرہ مرد کا جسم شیر کا۔ یہ رازوں کا صیغہ! ایک شاہی معما! ایک انگریزی استعارہ؛ خیال تھا کہ میں اس کے آگے بَونا معلوم ہوں گی۔ لیکن میں نے اس کے سامنے گردن تان کر تصویر کھنچوائی۔ نہ میں اتنی چھوٹی تھی نہ وہ اتنی بڑی۔ ایک وقت میں ہم دونوں کیمرے کے لینز میں سما گئے۔

آگے چلے تو اہرامِ مصر۔ باہر سے اینٹوں کے سنگین تکون اندر سے مہیب فرعونی مقبرے۔ ہولناک حیرت انگیز! تین ہزار سال قبل از مسیح! کن شاہی معماروں نے تراشے ہوں گے؟ کتنے سالوں میں مزدوروں کی قربانی سے تیار ہوئے؟ ان کی مٹی انسان کے خون سے گندھی۔ ان کی اینٹوں میں انسان کی ہڈیاں پسیں۔ لاکھوں غلاموں کے آنسو اور آہ و بکا سے فرعونیت نے ارضِ ابدیت خریدی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انسان کی نخوت و وحشت کہاں جا کر رکے گی! اہرامِ مصر اندر سے زیادہ وسیع اور بارُعب معلوم ہوتے ہیں ہم نے چالیس منٹ میں چار ہزار صدیاں طے کر لیں۔ جادو تھا کہ طلسم ہوشربا کے افسانے چھومنتر اور اونٹ گاڑیوں سے کود کر جدید

---

[1] یہ فروری کا مہینہ تھا اور نیل کا پانی بالکل اتر چکا تھا۔ [2] ابوالہول کا مجسمہ، جس کا سر انسان کا اور دھڑ شیر کا ہے۔

کاروں میں بیٹھ گئے۔ صحراؤں کی ازلی خاموشی اور بیسویں صدی کے ہارن، موٹر، مختلف زمان ومکان کا تصادم۔

خنکی شدید ہوتی جارہی تھی۔ بس ابھی گرم ہی ہوئی تھی کہ ۲۰ میل پر روک دی گئی۔ فوجی قافلوں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ قاہرہ واپس جاؤ۔ اسرائیل نے کئی جگہ پر چھاپے مارے ہیں اور پورٹ سعید کے راستے بند کر دیے ہیں'' بس میں ایک دم کھلبلی مچ گئی۔ ہمارا جہاز لنگر ڈالے ہمارا انتظار کررہا تھا۔ دو بجے رات کو اُسے لنگر اُٹھانا تھا۔ ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ رات قاہرہ گزار کر ہوائی جہاز سے دوسرے دن جنیوا چلے جائیں۔ ایک شور، ایک خلفشار! آخر قاہرہ واپس آئے۔ انگریزی سفیر نے مرکزی وزارتِ خارجہ سے اجازت دلوائی بس روانہ ہوئی۔ پچاس میل تک پھر مصری فوجوں نے روک دیا۔ ''واپس جاؤ'' ہم کوئی پرمٹ وغیرہ نہیں مانتے۔'' ہمارے ساتھیوں کا اعصابی نظام ڈھیر ہوگیا۔

''کہاں ہے تمھارا کپتان بُلاؤ اُسے۔''

بہت سی کج بحثی کے بعد آخر کار ہماری بس روانہ ہوئی۔ رات کے خنک خلد میں چاند اکیلا تن تنہا لٹک رہا تھا۔ صرف دو تارے اُس وقت اس کا ساتھ دے رہے تھے باقی سب روپوش ہو چکے تھے۔ کُچھ دُم دار گھبراہٹ میں اپنی دُمیں پیچھے چھوڑتے گئے۔ جوں جوں بس میل طے کرتی، مسافروں کے روکے ہوئے سانس رواں ہوئے۔ اُمید بندھی کہ آخر ہم وقت پر پہنچ جائیں گے۔

''زندگی سمجھنے کا وقت کہاں دیتی ہے۔ وہ دیکھو منزل کے آخری پاؤں!''

ہمارا جہاز ساحل سے دُور سرمئی دُھند میں کھڑا تھا۔

(سات سمندر پار)

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- قاہرہ کی عمر کتنی بتائی جاتی ہے؟

ii- مصنفہ نے دریائے نیل کی کیا خصوصیات بیان کی ہیں؟

iii- اہرامِ مصر کی تعمیر کب ہوئی؟

iv- پورٹ سعید سے بس قاہرہ کتنے وقت میں پہنچی؟

2- اس سبق کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے اور جملوں میں استعمال کیجیے:

بے اعتنائی، صبح کاذب، فراخی، قدامت، تخیل، مغالطہ، معمہ، مہیب، نخوت آہ وبکا، خنکی، کج بحثی، روپوش، نابلد۔

4- درج ذیل بیانات میں سے جو صحیح ہیں، ان کے آگے "ص" اور جو غلط ہیں اور ان کے آگے "غ"، لکھیے:

i- جہاز والوں نے بارہ گھنٹے کا پورا استعمال بتا کر ۵۷ روپے وصول کر لیے تھے۔ ص / غ

ii- لاکھوں غلاموں کے آنسو اور آہ وبکا سے فرعونیت نے ارض ابدیت خریدی۔ ص / غ

iii- ہم نے بیس منٹ میں چار ہزار صدیاں طے کر لیں۔ ص / غ

iv- ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ رات قاہرہ گزار کر ہوائی جہاز سے دوسرے دن جنیوا چلے جائیں۔ ص / غ

v- انگریزی سفیر نے مرکزی وزارتِ داخلہ سے اجازت دلوائی۔ ص / غ

مکتوب نگاری

اگر ہم کسی شخص سے کوئی بات کہنا چاہیں اور وہ ہمارے سامنے موجود نہ ہو تو اسے اپنی بات اور گفتگو سے لکھ بھیجنا مکتوب نگاری یا خط نویسی کہلائے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے الفاظ میں ''خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے''۔ مکتوب نویسی ادب کی قدیم ترین شکل ہے۔ خط نویسی کی متعدد قسمیں ہیں۔ ادبی اور علمی خطوط ایک صنف نثر کی حیثیت سے کئی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی شخصیت کے خطوط کا ذخیرہ اس کی سیرت و کردار اور رجحانات کو بے نقاب کرتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری میں غالب کا اسلوب بڑا منفرد ہے۔ سر سید احمد خاں، حالی، مولوی عبدالحق اور مولانا ابوالکلام آزاد کی مکتوب نگاری میں اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے مکاتیب اقبال کے اردو مجموعے سب سے زیادہ ہیں۔ خطوطِ اقبال میں اردو نثر کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ مکتوب نج کی گفتگو ہے یہ گفتگو جتنی فطری اور ڈرامائی انداز میں ہوگی اتنی ہی پر لطف ہوگی۔ تصنع و بناوٹ اور مرصع کاری خط کا نقص ہے۔ بے تکلفی، سادگی اور جامعیت اچھے خط کے اہم خواص ہیں۔

(۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

آپ ۱۷۹۷ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ غالب بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ لہٰذا ان کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے کی لیکن آٹھ سال کی عمر میں ان کے چچا بھی وفات پا گئے۔ مرزا غالب نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد اعظم سے حاصل کی۔ نواب احمد بخش خاں نے مرزا کے خاندان کا انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام عمر ان کے ثنا خواں رہے۔ تیرہ سال کی عمر میں ان کی شادی نواب احمد بخش کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ شادی کے بعد انھوں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

غالب نے جس طرح اردو شاعری میں اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی۔ اسی طرح اردو نثر میں بھی وہ ایک طرز خاص کے موجد تھے۔ غالب نے نثر کی جو روایت قائم کی، وہ اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے، اس میں جو جدت پیدا کی، اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی۔ سادگی، جدت، بے تکلفی، اختصار اور ڈرامائیت ان کے خطوط کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کی تصانیف میں دیوان اردو و فارسی، گل رعنا، پنج آہنگ، مہر نیمروز، قادر نامہ، قاطع برہان، لطائف غیبی، عود ہندی اور اردوئے معلّٰی شامل ہیں۔

مکاتیب غالب

(1) خط بنام: امین الدین احمد خان:

بھائی صاحب!

آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ[1] قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں۔ تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں: اظہار غم، تلقین صبر، دعائے مغفرت۔ سو بھائی اظہارِ غم تکلفِ محض ہے جو غم تم کو ہوا ہے، ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو، تلقینِ صبر بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے، جس نے غمِ رحلت نواب[2] مغفور کو تازہ کیا۔ پس ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دُعائے مغفرت، میں کیا اور میری دُعا کیا؟ مگر چونکہ وہ میری مربیہ و محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔ معہذا تمھارا یہاں آنا سنا جاتا تھا، اس واسطے خط نہ لکھا۔ اب جو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے اور

---

[1] بیگم جان والدہ صاحبہ امین الدین احمد خاں و ضیاء الدین احمد خان

[2] نواب احمد بخش خاں والد مکتوب الیہ

اس سبب سے آنا نہ ہوا۔ یہ چند سطریں لکھی گئیں۔حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور خوش رکھے۔

تمھاری خوشی کا طالب، غالب

۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء

(2) خط بنام: میر مہدی حسین[1] مجروح

جانِ غالب،

اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچھا ہوں، تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ء تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔ میر نصیر الدین آئے کئی بار، مگر میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ اب کے بار دورے میں مجھ کو غفلت بہت رہی۔ احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں، سید صاحب نہیں آئے۔ تمھاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں، جتنی گرد اُڑی، اس کو آپ نے ازراہِ محبت آنکھوں میں جگہ دی۔ بہر حال اچھے ہو جاؤ اور جلد آؤ۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین کا خط آیا تھا۔ میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا۔ یہ رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا تا کہ میر سرفراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں اور میرن صاحب میرے پاس الفت پر اطلاع پائیں۔

چہار شنبہ ۶ - جون ۱۸۶۰ء

(خطوط غالب: مرتبہ غلام رسول مہر)

---

[1] مرزا غالب کے عزیز شاگرد تھے۔ ۱۹۰۳ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

(۱۸۸۲ء - ۱۹۵۹ء)

محمد علی ردولوی

محمد علی ردولوی ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اودھ کے تعلق داروں میں شامل تھے۔ آپ ڈھائی سال کے تھے کہ والد وفات پا گئے۔ والدہ نے بہت لاڈ سے پالا۔ ہر وقت نظروں کے سامنے رکھا اور پڑھنے نہ دیا۔ آپ کے تعلقہ کے انگریز مینیجر نے آپ کو زبردستی سکول میں داخل کرایا، مگر آپ بھاگ نکلے۔ اس لیے باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے۔ باقاعدہ تعلیم سے محرومی کے باوجود آپ علم سے محروم نہ رہے۔ آپ نے غیر رسمی طریقے سے اور اپنے طور سے بہت کچھ پڑھ لیا۔ انگریزی ادب فلسفہ ، آرٹ اور مذاہب عالم کا گہرا مطالعہ کیا اور زندگی بھر ادب اور فلسفے سے تعلق قائم رکھا۔

محمد علی نے افسانے، خاکے، مضامین اور ڈرامے لکھے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کیے۔ خطوط کا ایک مجموعہ "گویا دبستاں کھل گیا" شائع ہوا۔ ان خطوط کو سادگی، برجستگی، جوش طبعی اور روشن خیالی نے ادبی حسن اور اہمیت عطا کر دی۔

ولایت حسین صاحب کے نام

ڈیئر ولایت حسین صاحب! تسلیم۔ آپ کا آخری کارڈ آیا۔ آپ ماشاء اللہ جوان آدمی، پڑھے لکھے، سمجھ دار، ذمہ دار، بالغ، عاقل، مکلّف، راستے کی مشکل، سفر کی صعوبتوں کی اس قدر پوچھ گچھ کیا ہے۔

ارے صاحب! الہٰ آباد کے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر ڈھونڈ لیجیے۔ ردولی کا ٹکٹ لیجئے اور ہمت کر کے ریل میں بیٹھ جایئے۔ اور احتیاط مدنظر ہو تو جو ماما آپ کے گھر کھانا پکاتی ہے اس سے کہیے کہ داہنے بازو پر ایک پیسا امامِ ضامن کا باندھ دے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے [1]

فیض آباد کے اسٹیشن پر کوئی نہ کوئی بندہ خدا مل ہی جائے گا جو لکھنو جانے والی گاڑی پر آپ کو بٹھا دے گا۔ فیض آباد کے اسٹیشن پر بندر بہت ہیں مگر امام ضامن تو بازو پر بندھا ہی ہوگا، پھر ڈر کا ہے

---

1. شاعر کا نام حیدر علی آتش

کا ہے۔ ہم سفر ردولی کا اسٹیشن بتا دیں گے،.جی کڑا کر کے اتر پڑیے گا۔ اگر آمد کا وقت معلوم ہو گیا تو میرا آدمی وہاں موجود ہو گا۔ اگر میں اُس دن تک مر گیا تب بھی محمد علی کو لوگ اتنی جلدی بھول نہ گئے ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی خدا ترس آپ کو میرے گھر کا پتا بتا دے گا۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ آپ چل کھڑے ہویئے گا۔ سب سے پہلے میری بی بی سے میری باوقت موت کا پرسہ دیجیے گا۔ اس کے بعد اور باتیں کیجیے گا۔ البتہ اسٹیشن سے غریب خانے تک سڑک خراب ہے۔ یکے تانگے کا ڈنڈا مضبوط پکڑے رہیے گا۔ خدا چاہے گا تو بیڑا پار ہے۔ آپ خدانخواستہ موم کے بنے تو ہیں نہیں کہ دھوپ میں دشمنوں کے پگھل جانے کا ڈر ہو، شکر کا پنڈا تو ہے نہیں کہ برسات میں بہ جائے پھر کیا پروا ہے اور تقدیر میں خدانخواستہ، نصیبِ دشمناں، لاکھوں کوس دور، سات قرآن درمیان، شیطان کے کان بہرے، اگر کچھ ایسا ہی لکھا ہے تو رِضَا بِقَضَائِہٖ تَسْلِیْمًا لِاَ مْرِہٖ[1] مجبوری ہے۔ اگر آپ کے دل میں اس بات کا دھڑکا ہو کہ میں مہمان کو مار ڈالتا ہوں تو الٰہ آباد میں صدیق حسن صاحب ممبر بورڈ آف ریونیو، سراج الدین احمد صاحب ڈی۔ آئی۔ جی۔ پولیس، جسٹس رگھبیر دیال صاحب، رگھوپتی سہائے صاحب فراق لیکچرر یونیورسٹی، جسٹس ولی اللہ جن سے مجھے میٹروپول ہوٹل، نینی تال میں ملاقات ہوئی تھی، ان حضرات سے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں آدم خوری کا شوق نہیں رکھتا۔ اصل معاملہ تو ایک طرف رہا، مجھ کو بڑا اشتیاق آپ کی زیارت کا ہے اور امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ میرے آپ کے مراسم گہرے ہو جائیں گے۔ ع

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

بندہ محمد علی عفی عنہ۔ ردولی

اودھ

۶ مارچ ۱۹۵۲ء

---

[1] قضائے خداوندی کو بخوشی تسلیم کرنا اس کے حکم کی پابندی ہے۔

سوالات

1- مختصر جواب دیجیے:

i- غالب کے پہلے خط میں بیگم صاحبہ اور نواب مغفور کا اشارہ کس کی طرف ہے؟

ii- غالب نے دوسرے خط میں مجتہد العصر کس کو کہا ہے؟

iii- محمد علی ردولوی نے اپنے خط میں سفر کے بارے میں کیا لکھا؟

iv- خطوط غالب کی نمایاں خصوصیات تحریر کریں۔

2- مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے:

سانحہ، آزردگی، پاس الفت، مُطلع، عاقل، پُرسہ، اشتیاق، غریب خانہ، آسودہ،

3- اصل عبارت کے مطابق جملوں کی تکمیل کیجیے:

i- حق تعالیٰ تم کو سلامت اور تندرست اور .... رکھے۔

ii- .... کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔

iii- الہ آباد کے اسٹیشن پر .... ڈھونڈ لیجیے۔

iv- ہزار ہا شجر سایہ دار .... میں ہے۔

v- اسٹیشن سے غریب خانے تک .... خراب ہے۔

vi- ان حضرات سے تصدیق کر لیجیے گا کہ میں .... کا شوق نہیں رکھتا۔

حصّہ نظم

حمد

حمد عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی تعریف یا ثنا ہے۔ حمد، غزل، قطعہ، رباعی اور مثنوی کی طرح کسی خاص ہیئت میں نہیں لکھی جاتی، اسی طرح اس کی کوئی قید اور وزن مخصوص نہیں۔ تاہم بعض ناقدین مرثیے کی طرح الگ ہیئت نہ ہونے کے باوجود حمد کو صنفِ سخن مانتے ہیں۔ شاعری کی قدیم کتابوں میں ہمارے اکثر شعرا اپنی کتابوں کا آغاز حمد سے کرتے تھے۔ اُردو شاعری کے اولین دور میں ''حمد'' کو خداوند تعالیٰ کے حضور مدحیہ قصیدے کے طور پر بھی برتا گیا۔

نعت

نعت کے لفظی معنی بھی تعریف ہے لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ نظم ہے جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی گئی ہو۔ یہ بھی بعض لوگوں کے خیال میں کوئی الگ صنفِ سخن نہیں لیکن موضوعِ سخن ہے۔ کیونکہ حمد کی طرح نعت کی بھی کوئی بحر یا وزن مقرر نہیں ہوتا۔ بعض ناقدین نعت کو بھی باقاعدہ صنفِ سخن مانتے ہیں۔

حمد کی طرح نعت کو بھی ایک تقدّس اور بلند درجہ حاصل ہے بلکہ دیکھا جائے تو ہماری اردو شاعری میں اکثر شاعروں کی توجہ حمد سے زیادہ نعت گوئی کی طرف ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہم نے اپنے اللہ کو اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے پہچانا ہے۔

بلاشبہ قدیم اردو شاعروں نے نعت گوئی میں نہایت عظیم کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن بیسویں صدی اور خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد اردو میں نعت گوئی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں جن نعت گو شاعروں کے مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں، ان میں ماہر القادری، حافظ مظہر الدین، عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، بہزاد لکھنوی، اثر صہبائی، اسد ملتانی، نظر زیدی، خالد بزمی، محشر رسول نگری، راسخ عرفانی، احمد ندیم قاسمی، محسن کاکوروی، منور بدایونی، حافظ لدھیانوی، حافظ محمد افضل فقیر، محمد اعظم چشتی، مظفر وارثی، راجا رشید محمود، سرور کیفی اور دیگر متعدد نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اس دَور کو نعت کا دور کہتے ہیں۔

(۱۸۲۶ء-۱۹۰۵ء)

محسن کاکوروی

نام محمد محسن اور محسن ہی تخلص تھا۔ کاکوری میں پیدا ہونے کہ وجہ سے محسن کاکوروی مشہور ہیں۔ ان کے آباواجداد ارضِ مقدس حجاز کے باشندے تھے۔ ان کے خاندان نے بعض اور جگہوں سے ہوتے ہوئے آخر میں ضلع لکھنؤ کے قصبہ کاکوری میں بودوباش اختیار کرلی۔ محسن یہیں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی حسن بخش ایک ممتاز عالمِ دین تھے۔ انھوں نے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں حضرت آدمؑ سے سرورِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے مفصل حالات درج ہیں۔

محسن کاکوروی کی شاعری میں خاص طور پر نعتیہ کلام زیادہ ملتا ہے۔ ان کی وجہ شہرت بھی ان کا یہی نعتیہ کلام ہی ہے جس میں خاص طور پر ان کی نعتیہ مثنویوں کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے بیٹوں مولوی نورالحسن اور مولوی محمد انوارالحسن نے ان کا کلام جمع کر کے محفوظ کرلیا تھا جو ''کلیاتِ نعتِ محسن'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپ کر منظرِعام پر آچکا ہے۔ نعتوں کے علاوہ ان کے مجموعہ کلیات میں صحابۂ کرام کے مناقب بھی موجود ہیں اور بعض دیگر اصناف میں بھی اشعار ملتے ہیں جن میں تاریخ گوئی بھی شامل ہے۔

اُن کی حمد اور نعت کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کی سرزمین سے تشبیہات واستعارات اخذ کرتے ہوئے اردو شاعری کے ذخیروں کو مالا مال کردیا۔

عبادتِ صُبح

ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گُل — کیفیتِ وحی میں ہے بلبل
یا خضر ہے مستعد وضو پر — سبزہ ہے کنارِ آبِ جُو پر
تیاری ہے باغ میں اذاں کی — نوبت ہے صدائے قُمریاں کی
قد قامت سرو دل ربا ہے — محوِ تکبیر فاختہ ہے
اور صلِّ علیٰ کا غُل چمن میں — پھیلی ہوئی بوئے گُل چمن میں
اور آبِ رواں طواف میں ہے — کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے
مجذوب ہے شاخِ بیدِ مجنوں — سالک ہے چمن میں نہرِ موزوں
یک سُو شب زندہ دار شبو — سجادہ بدوش لالہ یک سُو
ہر طائرِ شوخ ذکر میں ہے — ہر شمعِ خموش فکر میں ہے

سوالات

ا۔ ''عبادتِ صبح'' میں شاعر نے مظاہرِ فطرت کے حوالے سے حمد باری تعالیٰ میں صبح کے سُہانے وقت کی خوب صورت الفاظ میں جو تصویر کشی کی ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

۲۔ کلامِ نظم ونثر میں حسن و بیان کے حوالے سے مختلف ادبی اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے۔جس میں نمایاں اصطلاحات، تشبیہ اور استعارہ ہیں۔

تشبیہ میں کسی چیز کو کسی خاص مقصد اور غرض وغایت کی وجہ سے محض مشترک وصف یا اوصاف کی بنا پر دوسری چیز کے مانند قرار دیا جاتا ہے جس میں اکثر اوقات حروف تشبیہ بھی مذکور ہوتے ہیں۔ جبکہ استعارے میں ایسی ہی مطابقت کی بنا پر پہلی چیز پر دوسری چیز کا بعینہٖ اطلاق کر دیا جاتا ہے۔اس نظم میں سبزے کو خضر، نہرِ موزوں کو سالک اور بلبل کی سرمستی کو کیفیت وحی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جبکہ کیاری کو استعارتاً معتکف دکھایا گیا ہے۔اس نظم میں اس قسم کی تشبیہات واستعارات کی نشان دہی کرتے ہوئے اپنے استاد کی مدد سے تشبیہ واستعارہ کے تمام لوازمات کے ساتھ لکھیں۔

(۱۸۷۲ء-۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خاں

ظفر علی خاں نام، ظفر تخلص کرم آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ والد محکمہ ڈاک میں انسپکٹر تھے۔آپ نے علی گڑھ سے ایف۔اے کیا اور کشمیر میں جہاں ان کے والد متعین تھے۔محکمہ ڈاک میں ملازمت کر لی۔لیکن جلد ہی واپس علی گڑھ چلے گئے اور بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۰۳ء میں حیدر آباد سے ''افسانہ'' کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا تھا۔۱۹۰۹ء میں ہفت روزہ زمیندار کی ادارت سنبھالی اور اخبارات کے ذریعے برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔مولانا چار سال قید رہے۔ان کی زندگی اسی سیاسی کشمکش میں گذر گئی لیکن زبان وادب کی ہمیشہ خدمت کرتے رہے۔

نظم ونثر میں کئی کتابیں یادگار ہیں۔نثر میں معرکہ مذہب وسائنس، جنگل میں منگل اور غلبۂ رُوم مشہور ہیں۔نظم میں بہارستان، نگارستان اور چمنستان مشہور ہیں۔مولانا کے کلام میں زبان کی صفائی اور محاورہ بندی کی بہترین اور دلکش مثالیں نظر آتی ہیں۔مولانا ایک شعلہ بیان خطیب اور شاعر تھے۔ان کی شاعری میں قومی حمیت، اسلامی طرزِ فکر اور خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے۔

رحمتِ دو جہاںؐ

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تار الست سے
اس نورِ اولیں کا اجالا تمھیں تو ہو

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اُولیٰ تمھیں تو ہو

جلتے ہیں جبرئیلؑ کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھیں تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب وبطحا تمھیں تو ہو

دنیا میں رحمتِ دو جہاںؐ اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھیں تو ہو

سوالات

1- حمد اور نعت کے باہمی فرق کو واضح کیجیے۔

2- مندرجہ ذیل کی وضاحت کیجیے:

سینہ شب تار الست، نور اولین، غایت اولیٰ، تاجدار یثرب و بطحا۔

3- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

....

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اُولیٰ تمھیں تو ہو

....

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھیں تو ہو

نظم

نظم بہت جامع لفظ ہے۔ ایک تو یہ نثر کے مقابلے میں ہر قسم کے اشعار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوسرے اس سے مراد مخصوص ہیئتوں کے اشعار بھی ہیں جو کسی ایک مضمون یا موضوع پر مسلسل ہوں۔

نظم گو شاعروں میں نظیر اکبر آبادی کے نام کو اولیت حاصل ہے جس نے عام موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس سلسلے میں بعد کے شاعروں میں حالؔی اور محمد حسین آزاد کے نام فراموش نہیں کیے جا سکتے جنہوں نے نظم کی ترقی میں فکری اور عملی ہر دو سطح پر بھرپور کام کیا۔

علامہ اقبالؒ بھی مجموعی طور اور بنیادی حیثیت سے نظم کے شاعر ہیں۔ نظم گو شعرا میں نظیری، سیماب اکبر آبادی، تاجور نجیب آبادی، جوش ملیح آبادی، میرا جی، اختر شیرانی، احسان دانش، ن۔م راشد، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، مجید امجد وغیرہ شامل ہیں۔

ہمارے اس دور میں بھی بعض نظم گو شاعر موجود ہیں جن میں احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، منیر نیازی، احمد فراز، پروین شاکر، ادا جعفری وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ انھوں نے زمانہ حال تک عالمی سطح پر نظم میں ہونے والی تبدیلیوں کا پورا ساتھ دیا۔

(۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء)

نظیر اکبر آبادی

ولی محمد نام، نظیر تخلص، دہلی میں پیدا ہوئے۔ پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والدہ کے ساتھ آگرہ چلے آئے ایک مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ طبیعت میں موزونیت فطرت سے ملی ہوئی تھی۔ اس لیے شاعری شروع کی۔ نظیر ایک سادہ اور صوفی منش آدمی تھے۔ ان کی ساری عمر معلّمی میں بسر ہوئی۔ وہ قناعت پسند تھے اس لیے کسی دربار سے وابستہ نہ ہوئے۔

نظیر اکبر آبادی کی شاعری اپنی علیحدہ دنیا رکھتی ہے۔ انھوں نے میر وسودا کی بہار سخن بھی دیکھی اور دبستان لکھنو کی جوانی کا نکھار بھی لیکن ان کی آزاد منش اور منفرد رنگ طبیعت نے انھیں کسی دبستان کا پابند نہ ہونے دیا۔ انھیں اردو کا پہلا عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نظیر کا واحد ترکہ ان کا کلیات ہے۔

مُفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال
سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال
گر گِر پڑے تو کوئی نہ لیوے اسے سنبھال
مُفلس میں ہوویں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آکر پڑے شمار
مفلس کو دیویں ایک تونگر کو چار چار
گر مانگے اور وہ تو اسے جھڑکیں بار بار
اس مفلسی کا آہ بیاں کیا کروں میں یار
مفلس کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

سوالات

1- نظیر اکبر آبادی کی نظم ''مفلسی'' کا خلاصہ لکھیے۔

2- نظم کے بند نمبر ۵ کی تشریح کیجیے؟

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی بتائیے۔

عالم، مجلس، تونگر، مفلس، غربا، ہیچ، خاک۔

4- ذیل میں دیے ہوئے مصرعوں کو مکمل کیجیے۔

یہ دکھ وہ ....

اس مفلسی کا..........

سب جانیں روٹیوں کا..........

(۱۸۳۶ء - ۱۸۸۶ء)

میر حسن

میر حسن دلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد میر ضاحک سے تعلیم مکمل کی۔ اس پُر آشوب زمانے میں دلی ویران ہو رہی تھی، شُرفاء اور اہل علم دلی چھوڑ رہے تھے، میر حسن بھی فیض آبادِ جا بسے۔ دربار لکھنؤ منتقل ہوا تو آپ بھی وہاں چلے گئے۔ میر حسن نے شاعری کا ایک دیوان اور تین مثنویات یادگار چھوڑی ہیں مگر ''سحرالبیان'' ان کی سب سے مشہور مثنوی ہے۔ مثنوی عام طور پر طویل قصوں، داستانوں اور جنگوں کو منظوم کرنے کے کام آتی ہے۔ اکثر شعراء صوفیانہ خیالات اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لیے مثنوی کی صنف اختیار کرتے تھے۔ سحرالبیان میں میر حسن کے بیان کی سادگی، روانی، سلاست، منظر نگاری، سراپا نگاری اور جذبات نگاری نے زندگی پیدا کر دی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ میر حسن نے دہلوی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو اپنے بیان سے زندہ کر دیا۔ انھی خصوصیات کی بنا پر یہ ایک زندہ جاوید شاہکار ہے۔

داستان بینظیر کی بدر منیر کو اپنے وطن لے جانے اور ماں باپ سے ملاقات کرنے میں

پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ غل — کہ غائب ہوا تھا سو آیا وہ گل
خبر یہ ہوئی جب کہ ماں باپ کو — کیا گُم اُنھوں نے وہیں آپ کو
لگے رونے آپس میں زاروزار — کہا ہائے ہم کو نہیں اعتبار
کہا سب نے صاحب چلو تو سہی — یہ بیٹا تمھارا وہی ہے وہی
وُہ آتا تھا جیسے کہ بیٹا اُدھر — پڑی باپ پر جو یکا یک نظر
جونھی اپنے کعبہ کو دیکھا رواں — چلا سر کے بل بے نظیر جہاں
گرا پانوں پر کہ کے یہ باپ کے — خدا نے دکھائے قدم آپ کے
ملے پھر تو آپس میں وُہ خوب سے — کہ یُوسفؑ ملے جیسے یعقوبؑ سے
ہوئے شادوخُرّم صغیر و کبیر — چلے لے کے نذریں امیر و وزیر
مئے عیش سے سب کو مستی ہُوئی — نئے سر سے آباد بستی ہوئی
زنانی سواری اتروا کے ساتھ — پکڑ اُس گلِ نَو شگفتہ کا ہاتھ
در آمد ہوا گھر میں سرو رواں — لیے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں
کہ اتنے میں آگے نظر جو پڑی — تو دیکھا کہ ہے راہ میں ماں کھڑی
بہی چشم سے آنسوؤں کی قطار — گرا ماں کے پاؤں پہ بے اختیار
وہ ماں خُوب بیٹے کے لگ کے گلے — یہ روئی کہ آنسو کے نالے چلے
بہو اور بیٹے کو چھاتی لگا — وُہ دونوں کے دو ہاتھ باہم ملا
ہُوئی جان اور جی سے اُن پر نثار — پیا پانی ان دونوں پر وار وار
جگر پر جو تھے درد اور غم کے داغ — بجھے وصل سے ہجر کے وُہ چراغ
سب آپس میں رہنے لگے مِل مِلا — پھر آئے چمن میں وہ گُل کھِل کھلا

سوالات

1- مندرجہ ذیل کے معنی بتایئےاور جملوں میں استعمال کیجیے:

سر کے بل چلنا، شادوخرم، صغیروکبیر، گل نوشگفتہ، وصل، ہجر، نثار

2- مندرجہ ذیل مصرعے مکمل کیجیے:

خبر یہ ہوئی.........

خدانے دکھائے.........

کہ یوسف ملے.........

3- نظم کے متن کو مدنظر رکھتے ہوئے خالی جگہ پُر کیجیے:

i- کہ غائب ہوا تھا سو آیا وہ.........

ii- پڑی......... پر جو یکا یک نظر

iii- تو دیکھا کہ ہے راہ میں.........کھڑی

iv- بجھے وصل سے......... کے وہ چراغ

v- ....آپس میں رہنے لگے مَل ملا

4- علم بیان کی اصطلاح میں کسی مشہور واقعے، قصے یا روایت کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ جیسے اس مثنوی کے ع

کہ یوسفؑ ملے جیسے یعقوبؑ سے

میں حضرت یوسفؑ کی حضرت یعقوبؑ سے ملاقات کی تلمیح استعمال ہوئی ہے، آپ اس طرح کی پانچ تلمیحات وضاحت کے ساتھ لکھیں۔

(۱۸۰۲ء۔۱۸۷۴ء)

میر انیس

میر ببر علی انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد میر خلیق مشہور مرثیہ گو گزرے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی اور فن شعر میں اپنے والد سے رہنمائی حاصل کی۔ انیس سپہ گری اور شہسواری میں بھی ماہر تھے۔ شاعری ان کے گھر کی میراث تھی اور ان کے گھرانے کی زبان لکھنو میں سند تھی۔ ان کے اجداد شعر و ادب میں بڑی شاندار روایت قائم کر چکے تھے۔ دادا میر حسن مثنوی کے میدان میں اور والد میر خلیق مرثیہ میں باوقار حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ میر انیس بہت ہی خوددار اور پابند وضع تھے۔ انھوں نے تمام عمر مرثیہ کے لیے وقف کر دی۔ کلام میں مرثیوں کے علاوہ سلام، قطعات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔

ان کی مجلسوں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔ انیس کا سا مرثیہ پڑھنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ ایک ماہر فن اور قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے زبان کے دائرے کو بے انتہا وسیع کر دیا۔ نئے الفاظ، محاورات اور آرائش بیان سے شاعری نکھر گئی۔ فصاحت، بلاغت، منظر نگاری، جذبات نگاری اور ''بین'' لکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔

کربلا کے صف شکن مجاہد

کیا غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے
امت کی مغفرت کا سر انجام کر گئے
لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
فیض اپنا مثلِ ابرِ کرم ، عام کر گئے
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ مَلک جن کو روتے ہیں

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد
زخموں کو نخلِ قد پہ وہ سمجھے گلِ مراد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
مردانگی یہ پیاس میں ، فاقوں میں یہ جہاد
تیغوں سے بند کون سا ان کا کٹا نہ تھا
ہر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

رستم اُٹھا نہ سکتا تھا سر اُن کے سامنے
پھیکی تھی روشنیِ قمر اُن کے سامنے
شیروں کے کانپتے تھے جگر ان کے سامنے
اُڑتا تھا رنگ روئے سحر، ان کے سامنے
بخشا تھا نور، حق نے ہر ایک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن، جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

تاثیر کر گئی تھی انھیں صحبتِ امام
تھا نزع میں بھی خشک لبوں پہ خدا کا نام
لبریز تھے محبتِ حیدرؓ سے دل کے جام
ذی قدر ، ذی شعور ، دلاور ، خجستہ کام

لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں جسم پہ کیا جھوم جھوم کے

سوالات

1- ''کربلا کے صف شکن مجاہد'' کا خلاصہ لکھیے۔

2- مندرجہ ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے:

غازیانِ فوج خدا، مثلِ ابرِ کرم، نخلِ قد، گل مراد، روشنیٔ قمر، رنگِ سوئے سحر۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے:

تشنہ کام، مغفرت، فیض، بشر، مَلک، شجاع، معرکہ، سرفروش، خوش صفات، تیغ

4- ''کربلا کے صف شکن مجاہد'' کے بند نمبر۲ کی تشریح کیجیے۔

5- علمِ بیان کی روح سے مندرجہ ذیل الفاظ کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

نخلِ قد، تشنہ کام، رُستم، ہوتا تھا دن، جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

خواجہ الطاف حسین حالی

نوٹ: خواجہ الطاف حسین حالی کا تعارف حصہ نثر میں دیا جا چکا ہے۔

اسلامی مساوات

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال اُن میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل اُن کی ہادی، نہ دین اُن کا رہبر
نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا
نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا
نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا
تعیش میں جینا نمائش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بے ہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا
پریشاں اگر قحط سے اک جہاں ہے
تو بے فکر ہیں کیونکہ گھر میں سماں ہے
تو باغِ امت میں فصلِ خزاں ہے
تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گل فشاں ہے
بنی نوع انساں کا حق اُن پہ کیا ہے
وہ اِک نوع، نوعِ بشر سے جدا ہے

کہاں بندگانِ ذلیل اور کہاں وہ
بسر کرتے ہیں بے غمِ قوت و ناں وہ
پہنتے نہیں جز سَمور و کتاں وہ
مکاں رکھتے ہیں رشکِ خُلدِ جناں وہ
نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر
کمربستہ ہیں لوگ خدمت میں اُن کی
گل و لالہ رہتے ہیں صحبت میں ان کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں، ان کی
نزاکت سو داخل ہے عادت میں ان کی
دواؤں میں مُشک ان کی اٹھتا ہے ڈھیروں
وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں
یہ ہو سکتے ہیں ان کے ہم جنس کیوں کر
نہیں چین جن کو زمانے میں دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر
نہ رہنے کو گھر اور نہ سواری کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی
یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وُہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں

سوالات

1- جب کسی قوم کا بیڑہ تباہی کے قریب ہوتا ہے تو سب سے پہلے قوم کے کن افراد میں بگاڑ پیدا ہوتے ہیں؟

2- سوال نمبر 1 کے حوالے سے بتایئے کہ قوم کے افراد میں کون کون سے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں؟

3- ''اسلامی مساوات'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

4- مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی لکھیے:

بندگانِ ذلیل، خالقِ دوسرا، دمِ نزع، فصلِ خزاں، کتابِ ہدیٰ، گل فشانی، گل و لالہ، ہوا و ہوس۔

5- درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کیجیے کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

دفتر الٹنا، خودی سے گزرنا، کمر بستہ ہونا، تدبیر الٹنا، تقدیر کھوٹی ہونا

6- نظم ''اسلامی مساوات'' کا دوبارہ مطالعہ کیجیے اور جزو ''ا'' اور جزو ''ب'' میں سے الفاظ چن کر مترادف الفاظ کے جوڑے بنایئے اور صحیح جواب کالم ''ج'' میں لکھیے۔

ا	ب	ج
کمال	ہوس	
ہادی	خود فراموش	
آہ	کتاں	
ہوا	ناں	
بے ہوش	جوہر	
قوت	رہبر	
سمور	زاری	

7- مندرجہ ذیل الفاظ میں سے ہم قافیہ الفاظ کے جوڑے بنایئے:

عزت، تونگر، ایماں، روٹی، ڈھیروں، جنت، کھوئی، انساں، سروں، رہبر۔

8- نظم ''اسلامی مساوات کے پہلے اور آخری بند کی تشریح کیجیے۔

9- اگر کوئی نظم پانچ پانچ مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہو تو اسے "مخمس"، اور چھ چھ مصرعوں کے بندوں پر مشتمل ہو تو اسے "مسدس" کہتے ہیں۔ "اسلامی مساوات" کی ہیئت "مسدس" ہے اور یہ مولانا حالی کی شہرہ آفاق طویل نظم "مدوجزر اسلام" (مسدس حالی) سے اقتباس ہے۔ آپ بتائیے کہ علامہ اقبالؒ کی نظموں شکوہ اور جواب شکوہ کی ہیئت کیا ہے اور پھر ان دونوں نظموں کا ایک ایک بند اپنی کاپی میں تحریر کیجیے۔

(۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء)

اکبر الٰہ آبادی

اکبر حسین بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اکبر بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ والد سید تفضل حسین کا شمار معزز شہریوں میں تھا۔ والدہ بھی نہایت پرہیز گار تھیں۔ اکبر نے اپنے طبعی ذوق اور ذاتی مطالعہ کی بدولت عربی، فارسی اور انگریزی سے اچھی واقفیت پیدا کرلی، انگریزی کی تعلیم شروع کی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا۔

اکبر کو شعروشاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا لیکن ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس کا مزاج غزل اور غزل کی پیدا کی ہوئی روایت کے رنگ میں ڈوبا اور رچا ہوا تھا ان کی شہرت ان کی خوش طبعی اور ظرافت کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے نئی تہذیب کی کورانہ تقلید کو ہدف طنز بنایا ہے۔ سوسائٹی کے نکتہ چین اور مصلح کی حیثیت سے ان کی عظمت مسلّم ہے۔

رباعیاتِ اکبر

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا جن کو بینا پایا

....

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مُضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبؔر نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلّت سے ہو تو مرنا اچھا

....

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر
لکھیں یا رب مَلک مرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بے وفائی کی ہے
پایا نہیں میں نے اس کا انجام بخیر

....

روشن سینے میں شمع ایماں کر دے
دل تیری طرف رہے، وہ ساماں کر دے
دنیا سے ہو بے خبر تیرے شوق میں روح
یا رب اکبؔر پہ زیست آساں کر دے

....

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبیٰ کا تصور اور اللہ کی یاد

سوالات

1- ''رباعیات اکبر'' میں سے پہلی رباعی کی تشریح کیجیے۔

2- دوسری رباعی میں اکبر نے کس خواہش کا اظہار کیا ہے؟

3- پانچویں رباعی میں اکبر نے کن دو چیزوں کو دل کا محافظ قرار دیا ہے؟

4- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیے:

افعال مضر، اہل غیرت، لحد، مَلک، زیست، ناشاد، عقبیٰ، محافظ۔

5- ہر سوال کے آخر میں چار ممکنہ جوابات دیے گئے ہیں، درست جواب پر ''✓'' کا نشان لگائیے:

i- غفلت ہی میں..........کو ڈوبا پایا۔

ا۔ آدمی ب۔ انسان ج۔ حیوان د۔ جوان

ii- جینا..........سے ہو تو مرنا اچھا

ا۔ ذلت ب۔ عزت ج۔ شان د۔ آن

iii- لے جاؤں لحد میں اپنا..........بخیر

ا۔ اسلام ب۔ ایمان ج۔ سرمایہ د۔ مال

iv- یارب..........یہ زیست آسان کر دے

ا۔ اکبر ب۔ اصغر ج۔ جگر د۔ حالی

v- دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ..........کی

ا۔ دل ب۔ دماغ ج۔ آنکھ د۔ جسم

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

علامہ محمد اقبالؒ

اقبالؒ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے جہاں خوش قسمتی سے مولوی میر حسن جیسا شفیق استاد مل گیا۔قدرتی طور پر علم و ادب کی مناسبت تھی۔اس پر مولوی صاحب کی توجہ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

ایف۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔یہاں بھی خوش قسمتی سے انھیں ایک قابل استاد پروفیسر آرنلڈ مل گئے۔انھی کی صحبت سے اقبالؒ فلسفیانہ کردار بنا اور یہی وہ تعلق ہے جس نے اردو کو ایک مفکر و شاعر عطا کیا۔۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ نے اقبالؒ کو سر کا خطاب دیا۔اقبالؒ کی مشہور تصانیف بانگِ درا۔بالِ جبریل،ضربِ کلیم،ارمغانِ حجاز،پیامِ مشرق، اسرارِ خودی،رموزِ بیخودی،جاوید نامہ اور زبورِ عجم ہیں۔

شِکوہ

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں؟
نالے بُلبُل کے سنوں، اور ہمہ تن گوش رہوں؟
ہمنوا! میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں؟
جرأت آموز مِری تابِ سخن ہے مجھ کو
شِکوہ اللہ سے ، خاکم بدہن ، ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ ، تو معذور ہیں ہم
اے خدا! شکوہ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیوں کر؟
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا!

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

جوابِ شکوہ

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شُکر شِکوے کو کیا حُسنِ ادا سے تُو نے
ہم سخن کردیا بندوں کو خدا سے تُو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے ؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

کس قدَر تم پہ گِراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمھیں کہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے؟
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں ، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں ، اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارکِ آئینِ رسولؐ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شِعارِ اَغیار؟
ہو گئی کس کی نِگہ طرزِ سَلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں!

سوالات

-1 نظم ''شکوہ'' میں پہلے زمانے کے مسلمانوں کے جن کارہائے نمایاں کا ذکر کیا گیا ہے انھیں اختصار سے لکھیے۔

-2 ''جوابِ شکوہ'' میں موجودہ دور کے مسلمانوں کا جو کردار پیش کیا گیا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

-3 مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب لکے معنی لکھیے۔

زیاں کار، سود فراموش، فکر فردا، حاکم بدہن، خوگر حمد، اربابِ وفا، مسجود، خوگر پیکر محسوس، جوہر قابل، شان کئی، جذبِ باہم، شعار اغیار، طرزِ سلف، اسلاف

-4 مناسب الفاظ سے خالی جگہ پُر کیجیے:

-i ہمنوا! میں بھی کوئی .... ہوں کہ خاموش رہوں۔

-ii ساز خاموش ہیں، .... سے معمور ہیں ہم۔

-iii خوگرِ پیکرِ محسوس تھی .... کی نظر۔

-iv تیری .... میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

-v ہم سخن کر دیا بندوں کو .... سے تو نے۔

-vi جذب باہم جو نہیں محفل .... بھی نہیں۔

-vii کچھ بھی پیغام .... کا تمھیں پاس نہیں۔

(۱۹۰۰ء-۱۹۸۲ء)

حفیظ جالندھری

محمد حفیظ نام حفیظ تخلص مشرقی پنجاب کے ایک شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم جالندھر میں ہوئی۔خاندانی حالات اور گھریلو ذمہ داریوں کی بنا پر اپنی تعلیم تو مکمل نہ کر سکے مگر شاعری کے میدان میں آپ نے اپنا لوہا منوالیا۔حفیظ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے کارگاہ حیات میں اپنی کوشش اور کاوش سے مقام پیدا کیا اور علمی و ادبی دنیا میں اپنا سکہ جمایا۔آپ کو ابتدا ہی سے علم و ادب سے دل چسپی تھی۔ چنانچہ لاہور میں ہونہار بک ڈپو قائم کیا اور ادبی کتابوں کی طباعت اور اشاعت میں مصروف رہے پاکستان کے قومی ترانے کے آپ خالق ہیں۔آپ کی تصانیف میں شاہنامہ اسلام،سوز و ساز،نغمہ زار،تلخابۂ شیریں، حفیظ کے گیت،حفیظ کی نظمیں، چیونٹی نامہ وغیرہ ہیں۔

حفیظ جالندھری نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔انھوں نے مقصدیت اور ملی جذبہ کو مدنظر رکھا ہے۔

صحرا کی دُعا

یہ تشنہ لب جماعت جب یہاں پر رک گئی آ کر
دعا کی دامنِ صحرا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر
کہ اے صحرا کو آتش ناک چہرہ بخشنے والے
رخِ خورشید کو کرنوں کا سہرا بخشنے والے
ازل کے دن سے اب تک بھاڑ میں بھنتا رہا ہوں میں
صدائے رعد وباراں دور سے سنتا رہا ہوں میں
ہوا ہوں جب سے پیدا جان پانی کو ترستی ہے
مرے سینے کے اوپر آگ کی بدلی برستی ہے
میں سمجھا تھا مقدّر ہو چکی ہے دھوپ کی سختی
مری قسمت میں لکھی جا چکی ہے سوختہ بختی
بنایا رفتہ رفتہ سخت میں نے بھی مزاج اپنا
لیا ہر آبلہ پا سے زبردستی خراج اپنا
خبر کیا تھی الٰہی ایک دن ایسا بھی آئے گا
کہ تیرا ساقیِ کوثر یہاں تشریف لائے گا
اگر یہ بات پہلے سے مجھے معلوم ہو جاتی
مرے دل کی کدورت خود بہ خود معدوم ہو جاتی
خبر کیا تھی یہاں تیرے نمازی آ کے ٹھہریں گے
شہید آرام فرمائیں گے غازی آ کے ٹھہریں گے
خبر کیا تھی ملے گی یہ سعادت میرے دامن کو
بنایا جائے گا فرشِ عبادت میرے دامن کو
خبر ہوتی تو میں شبنم کے قطرے جمع کر رکھتا
چھپا کر ایک گوشے میں مصفّا حوض بھر رکھتا

وہ پانی ان مقدس مہمانوں کو پلا دیتا
میں اپنی تشنگی دیدارِ حضرتؑ سے بجھا لیتا

سوالات

1- ''صحرا کی دعا'' کے تیسرے، چھٹے، تیرھویں اور اٹھارھویں شعر کے مفہوم کی وضاحت کیجیے۔

2- محل استعمال کو پیشِ نظر رکھ کر بتایئے کہ مندرجہ ذیل سے کیا مراد ہے؟

ابرِ باراں، ساقی کوثر، آتش ناک، فرشِ عبادت، سوختہ بختی، صدائے رعد و باراں۔

3- صحرا نے اللہ تعالیٰ سے کیا دعا مانگی اور کیوں؟

4- مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی بتایئے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

تشنہ لب، رخ خورشید، آبلہ پا، کدورت، معدوم ہونا، مصفّا، تاسّف، نگہ داری، لاج، جلیل القدر، ساعت، ازل۔

5- اس نظم کا خلاصہ لکھیے۔

(۱۹۱۱ء-۱۹۸۵ء)

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں پائی لیکن اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے انگریزی اور عربی میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج ایسے اساتذہ کا مرکز بن گیا تھا، جن کے رجحانات انقلابی تھے۔ چنانچہ جب ترقی پسند تحریک کی بنیاد برصغیر میں رکھی گئی تو فیض اس میں پیش پیش تھے۔

آپ نیشنل کونسل آف آرٹس اسلام آباد کے نگران اعلیٰ اور حکومت پاکستان کے ثقافتی مشیر رہے ہیں۔ ''لینن امن پرائز'' بھی ماسکو میں دیا گیا۔ آپ کے شعری مجموعوں میں نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور آپ کو غزل ونظم میں یکساں شہرت حاصل ہوئی۔

اے وطن

آگئے ہم ، فدا ہوں تیرے نام پر!
تیرے پیغام پر، اے وطن اے وطن

نذر کیا دیں کہ ہم مال والے نہیں
آن والے ہیں اقبال والے نہیں

اپنی دولت یہی ، اپنا دھن ہے یہی
اپنا جو کچھ بھی ہے اے وطن ہے یہی

وار دیں گے یہ سب کچھ تیرے نام پر
تیری للکار پر، تیرے پیغام پر

تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
ہم لٹا دیں گے جانیں ترے نام پر

سر کٹا دیں گے ہم، تیرے پیغام پر
تیرے پیغام پر، اے وطن اے وطن

سوالات

1- فیض احمد فیض کی نظم ''اے وطن'' کا مرکزی خیال لکھیے۔
2- ''حبِ وطن'' کے موضوع پر کسی اور شاعر کی نظم تلاش کر کے لکھیے۔
3- مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
نذر، آن، دھن، پیغام، للکار، فدا، اقبال۔
4- فیض کے شعری مجموعوں خصوصاً ''دستِ صبا'' میں وطن کی محبت کے موضوع پر کئی اشعار موجود ہیں۔ اپنے استاد یا سکول کی لائبریری کی مدد سے ایسے چند اشعار نوٹ کر کے سنائیے۔

(۱۹۱۴ء-۱۹۸۲ء)

احسان دانش

نام احسان الحق، احسن تخلص، ادبی حلقوں میں احسان دانش کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے والد ایک درویش منش اور بلند کردار انسان تھے۔ احسان کاندھلہ ضلع یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ نہایت غریب تھا اس لیے بمشکل پرائمری تک تعلیم حاصل کر سکے۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش ہوئی۔ مختلف اوقات میں مختلف نوکریاں کیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے تھے مگر علم کی لگن دل میں موجود تھی ذاتی مطالعہ جاری رکھا اور مشق سخن کرتے رہے۔ آخر ایک وقت آیا جب ان کا شمار اردو کے بڑے اور نامور شعرا میں ہونے لگا۔ ان کا سب سے پہلا مجموعہ ''حدیث ادب'' کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرے شعری مجموعوں میں چراغاں، آتش خاموش، جادہ نو، شیرازہ، گورستان اور میراثِ مومن شامل ہیں۔

احسان دانش کی شاعری مزدوروں اور کسانوں کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ نیز جاگیردار اور صنعت کار کے مظالم کا شعور بھی ہے۔ اُردو شاعری میں یہ واحد شاعر ہیں جن کا پیشہ ان کا شعری تجربہ بھی بن گیا۔

دعوتِ عمل

کیوں گناہگار رہیں ، کیوں نہ نکو کار بنیں
ہو چکا عظمت اقدار کا برسوں بیوپار
زیست کو زیست بنائیں کہ چلے کار جہاں
موت کو موت سمجھنا نہیں مردوں کا شعار
امتیاز حق و باطل ہے بڑے کام کی چیز
یہ تعصب ، یہ حسد تنگ دلوں کا ہے شعار
اس سے مانگو کہ جو دیتا ہے شہنشاہوں کو
اس سے کم بات ہے کم ظرف گدائی میں شمار
مل کے سب کیوں نہ وفاداری کا پیمان کریں
اپنے اخلاق پہ ایمان پہ احسان کریں
غمِ دوراں سے نکلنے کی تو صورت ہے یہی
مل کے سب کیوں نہ وفاداری کا پیمان کریں
بازو ڈھلکا کے، فقط اشک بہانے سے حصول
ہم نشیں ہار کے کیوں سب کو پریشان کریں
کیوں نہ معیار طلب اپنا رکھیں سب سے بلند
کیوں نہ آئینہ سے اطراف کو حیران کریں
یہ تعصب کا محل ہے، نہ عداوت کی فضا
کیوں نہ انسان کو انسان کا نگہبان کریں !
عہد پھر عہدِ رسالت کی طرح ہو مضبوط !
کفر و ایمان کی اعمال سے پہچان کریں

سوالات

-1 نظم ''دعوت عمل'' کا مرکزی خیال لکھیے۔

-2 ''دعوت عمل''میں شاعر کس قسم کے اعمال کی دعوت دیتا ہے؟

3 مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے۔

نکوکار، اقدار، عظمت، زیست، شعار، امتیاز، تعصب، گدائی، پیمان، عداوت، باطل، اشک، نگہبان، ہم نشین، بیوپار۔

-4 کالم (الف) کے ہر لفظ کا تعلق کالم (ب) کے بے ترتیب الفاظ کے ساتھ ہے۔ درست جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم الف	کالم ب	کالم ج
حق و	دوران	
غمِ	باطل	
عہدِ	ایمان	
کفرو	رسالت	
گناہ گار	طلب	
معیار	نکوکار	

احمد ندیم قاسمی

(نوٹ: تعارف حصہ نثر میں دیا جا چکا ہے)

شہیدوں کا لہو

شہیدوں کا لہو وہ نور ہے جس کی تجلی سے یقین افراد کے، نسلوں کے مستقبل سنورتے ہیں
اسی کی تابشوں سے آسمانِ فکر و دانش پر
نئی صبحیں بکھرتی ہیں، نئے سورج اُبھرتے ہیں
شہیدوں کا لہو وہ پھول ہے جس کے تعطر سے چمن کھلتے ہیں ذہنوں میں امنگوں میں خیالوں میں
اسی کے رنگ سے یوں زندگی کا حسن بڑھتا ہے
جوانی جس طرح شمعیں جلا دیتی ہے گالوں میں
شہیدوں کا لہو وہ نقش ہے انساں کی غیرت کا جسے دنیا جہادِ حریت کا نام دیتی ہے
مشیت کو بھلی لگتی ہے جب یہ شان، مرنے کی
تو پوری قوم کو اس نقش کا انعام دیتی ہے
شہیدوں کا لہو وہ درد ہے، جس کی چمک دل میں کئی چہرے بناتی ہے کئی یادیں اگاتی ہے
انہی چہروں، انہی یادوں سے بنتی ہیں وہ تصویریں
کہ جن سے قوم اپنا قصر مستقبل سجاتی ہے
شہیدوں کا لہو وہ آسماں ہے جس کے سائے میں سنور جاتی ہیں تاریخیں، نکھر جاتی ہیں تہذیبیں
اسی کی وسعتوں میں وہ ستارے، رقص کرتے ہیں
کہ جن کو توڑ سکتی ہیں نہ تعزیریں، نہ تادیبیں

سوالات

1- نظم ''شہیدوں کا لہو'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

2- شہید کا کیا مفہوم ہے؟

3- مندرجہ ذیل مصرعے مکمل کیجیے۔

i- نئی صبحیں بکھیرتی ہیں، نئے ....ابھرتے ہیں۔

ii- ....جس طرح شمعیں جلا دیتی ہے گالوں میں

iii- تو پوری..........کو اس نقش کا انعام دیتی ہے۔

iv- سنور جاتی ہیں تاریخیں، بکھر جاتی ہیں..........

v- اسی کی وسعتوں میں وہ..........رقص کرتے ہیں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

تجلی، تابش، شمع، نقش، حریت، مشیت، امنگ، وسعت، قصر، چمن

5- اس نظم میں شہید کے لہو'' کو مختلف اشعار میں مختلف اشیا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کوئی سی تین تشبیہات کا ذکر کرتے ہوئے وجۂ شبہ بھی تحریر کریں۔

(۱۹۱۸ء - ۱۹۹۹ء)

سید ضمیر جعفری

سید ضمیر جعفری ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام سید ضمیر حسین شاہ تھا۔ آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور عمر کا بیشتر حصہ فوجی ملازمت میں گزارا۔

سید ضمیر جعفری طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کی سنجیدہ شاعری کا بنیادی موضوع زیادہ تر ''حب وطن'' ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے زیادہ تر سیاسی اور معاشرتی صورتوں کو موضوع بنایا ہے جس میں خالص مزاح کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کی شاعری کا مشہور مجموعہ ''مافی الضمیر'' ہے۔

اِک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

اسی میں ملّتِ بیضا سما جا، کود جا، بھر جا
تری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تیسرا درجا
نہ گنجائش کو دیکھ اس میں نہ تُو مردم شماری کر
لنگوٹی کس، خدا کا نام لے، گُھس جا سواری کر
عبث گننے کی یہ کوشش کہ ہیں کتنے نفوس اِس میں
کہ نکلے گا بہر عنوان تیرا بھی جلوس اس میں
وہ کھڑکی سے کسی نے مورچہ بندوں کو للکارا
پھر اپنے سر کا گٹھڑ دوسروں کے سر پہ دے مارا
کسی نے دوسری کھڑکی سے جب دیکھا یہ نظارا
زمین پر آرہا "دھم" سے کوئی تاجِ سرِدارا
یہ سارے کھیت کے گنّے کٹا لایا ہے ڈبّے میں
وہ گھر کی چارپائی تک اُٹھا لایا ہے ڈبّے میں
کسی پیچاک میں صیقل کلہاڑا جگمگاتا ہے
کسی روزن سے اِک کالا سلیپر منہ کو آتا ہے
کھڑے ٹھٹّے بمعہ مینارِ آتش دان تو دیکھو
یہ قومِ بے سروسامان کا سامان تو دیکھو
وہ اک رسّی میں پورا لاؤ لشکر باندھ لائے ہیں
یہ، بستر میں ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں
صُراحی سے گھڑا، روٹی سے دستر خوان لڑتا ہے
مسافر خود نہیں لڑتا مگر سامان لڑتا ہے

سوالات

1- اس نظم میں ریل کے تیسرے درجے کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

2- ذیل کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

الف۔ اسی میں ملّتِ بیضا سما جا، کود جا، بھر جا
تری قسمت میں لکھا جا چکا ہے تیسرا درجا

ب۔ عبث گننے کی یہ کوشش کہ ہیں کتنے نفوس اِس میں
کہ نکلے گا بہر عنوان تیرا بھی جلوس اس میں

ج۔ وہ اک رسّی میں پورا لاؤ لشکر باندھ لائے ہیں
یہ، بستر میں ہزاروں تیر و نشتر باندھ لائے ہیں

3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی بتایئے اور انھیں اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:
ملّت بیضا، مردم شماری، نفوس، تاج سرِ دارا، پیچاک، صیقل، روزن، مینارِ آتشدان، لاؤ لشکر، تیرو نشتر

4- اس نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

غزل

غزل

غزل اردو کی مقبول ترین صنف نظم ہے۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک نظم ہوتا ہے۔ نظم میں ایک ہی عنوان پر مسلسل اشعار لکھے جاتے ہیں جبکہ ایک ہی غزل میں کئی مضامین موجود ہو سکتے ہیں۔ایجاز، اختصار، ایمائیت اور نرم و نازک عاشقانہ لہجہ غزل کی ادائیگی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ غزل ایک پابند نظم ہوتی ہے جس میں وزن، قافیے اور ردیف کی بھی پابندی کرنی پڑتی ہے۔غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے۔حسن و عشق غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے۔اس کے علاوہ بھی غزل میں متنوع موضوعات کے بیان کی بڑی گنجائش ہے اردو غزل فارسی غزل کی مرہونِ منت ہے۔ولی دکنی اردو کا پہلا قابل ذکر غزل گو ہے۔غزل کے ارتقا میں میر، سودا، درد، انشا، جرات، مصحفی، آتش، غالب، ذوق، مومن، ظفر، داغ اور حالی کا قابل قدر حصہ ہے۔غالب کا اندازِ بیان سب سے منفرد ہے۔اقبالؒ نے غزل کو نئے ذائقوں سے روشناس کرایا چند اہم غزل گو شعرا یہ ہیں:

یگانہ، فانی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، فراق، فیض، احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی، ناصر کاظمی، احمد فراز، منیر نیازی، پروین شاکر، سلیم احمد۔

(۱۷۱۹ء-۱۷۸۵ء)

خواجہ میر درد

خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا۔ درد دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ محمد ناصر تھا جو فارسی کے اچھے شاعر تھے اور عندلیب تخلص کرتے تھے۔ ظاہری و باطنی کمالات اور جملہ علوم اپنے والد سے حاصل کیے۔ درویشانہ تعلیم نے روحانیت کو جلا دی اور تصوف کے رنگ میں ڈوب گئے۔ موسیقی کے فن سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ ایک باعمل صوفی تھے اور دولت وثروت کو ٹھکرا کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ان کے زمانے میں دہلی ہنگاموں کا مرکز تھی۔ چنانچہ وہاں کے باشندے معاشی بدحالی، بےقدری اور زبوں حالی سے مجبور ہو کر دہلی سے نکل رہے تھے، لیکن درد کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی اور وہ دہلی میں مقیم رہے۔

درد کو بچپن ہی سے تصنیف وتالیف کا شوق تھا ان کی متعدد تصانیف فارسی زبان میں ہیں۔ شاعری میں ایک دیوانِ فارسی اور ایک دیوانِ اردو ہے۔

(۱)

ان نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں
پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

پھرتی رہی تڑپتی ہی عالم میں جا بجا
دیکھا نہ میری آہ نے روئے اثر کہیں

مدت تلک جہان میں ہنستے پھرا کیے
جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

یوں تو نظر پڑے ہیں تن افگار اور بھی
دل ریش کوئی آپ سا دیکھا نہ پر کہیں

ظالم! جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تُو، وَلے
پچھتاوے پھر تُو آپ ہی، ایسا نہ کر کہیں

پوچھا میں درد سے کہ بتا تو سہی مجھے
اے خانماں خراب! ہے تیرا بھی گھر کہیں

کہنے لگا مکانِ معیّن فقیر کو
لازم ہے کیا کہ ایک ہی جاگہ ہو، ہر کہیں

(۲)

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے اِدراک و فہم یاں
دوڑے ہزار، آپ سے باہر نہ جا سکے

مستِ شراب عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے درد! چاہے لائے بے خود، پھر نہ لا سکے

سوالات

1- غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ردیف ہوتے ہیں۔ میر درد کی شامل نصاب غزلیات کے مطلع کی نشان دہی کیجیے۔

2- غزل کے آخری شعر میں عموماً شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔ اگر شاعر آخری شعر میں تخلص استعمال نہ کرے تو اس شعر کو آخری شعر کہتے ہیں۔ اگر غزل کے کسی اور شعر میں شاعر کا نام آئے اُس پر علامت نہیں لگائیں گے۔ درد کی دونوں غزلیات کے مقطع کی نشان دہی کریں۔

3- ایسا لفظ یا الفاظ جو غزل کے مطلع کے دونوں مصرعوں اور دیگر اشعار کے ہر دوسرے مصرع کے آخر میں بار بار دہرائے جائیں، ردیف کہلاتے ہیں۔ درد کی غزلیات کے ردیف لکھیں۔

4- مطلع کے دونوں مصرعوں اور پھر ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں ہم آواز الفاظ یا حرکات وسکنات قافیہ کہلاتی ہیں جیسے گلاب، سراب وغیرہ۔ درد کی غزلیات کے ہم قافیہ الفاظ لکھیں۔

5- مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے:
روئے اثر، تن افگار، ارض وسما، ادراک وفہم، شراب عشق، نقش قدم

(۱۷۲۴ء۔۱۸۱۰ء)

میر تقی میر

میر تقی میر اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر متقی تھا۔ والد کی وفات کے بعد دلی چلے آئے۔ وہاں خان آرزو کے شاگرد ہو گئے مگر جلد ہی ان سے لگاؤ ہو گیا۔ آپ نے طویل عمر پائی اس لیے زندگی کے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ آپ کی زندگی کا عہد بھی بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ دلی حملہ آوروں کی زد میں تھا اس لیے وہاں چین نصیب نہ ہو سکا۔ آپ لکھنو چلے آئے۔ دربار سے وابستہ ہو گئے، مگر وہاں نبھ نہ سکی۔

میر تقی میر کی شاعری کے سوز و گداز کا بہت چرچا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی کو ہر رخ اور ہر رنگ سے برتنے اور بیان کرنے کا جو سلیقہ میر کے ہاں ملتا ہے، وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ میر زندگی کے درد پر رونا بھی جانتے ہیں اور خوشی پر مسکرانا بھی۔ انھیں حسن سے لذت حاصل کرنے کا سلیقہ بھی میسر ہے اور تصویریں بنانے کا فن بھی ان کی خصوصیت ہے۔ مزید یہ کہ وہ دلی والوں کی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے ہاں جس قدر زندہ شعر موجود ہیں اردو میں کوئی دوسرا شاعر اس کی مثال نہیں لا سکتا۔ غزل کے اکثر بڑے شعرا نے میر کو استاد تسلیم کیا ہے۔ غزل میں ان کا مرتبہ تمام غزل گو شعرا سے بلند ہے۔

(۱)

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ
وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک، انتہا ہے یہ

بس ہوا ناز ، ہو چکا اغماض
ہر گھڑی ہم سے ، کیا ادا ہے یہ

ہے رے بیگانگی کبھو اُن نے
نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ

مبرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

(۲)

حالِ دل میرؔ کا اے اہلِ وفا ، مت پوچھو
اُس ستم کشتہ پہ جو گزری جفا ، مت پوچھو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اُسے شام کو تند
کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا ، مت پوچھو

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اُس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو

وقتِ قتل ، آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر، اُن نے کہا ، مت پوچھو

خواہ مارا انھیں نے میرؔ کو ، خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا ، مت پوچھو

سوالات

1- میر کی غزلیات کے ردیف لکھیں۔

2- میر کی غزلیات کے قافیہ اور ردیف لکھیں۔

3- میر کی غزلیات کا مطلع اور مقطع لکھیں۔

4- مندرجہ ذیل مصرعوں کو مکمل کریں:

بس ہوا ناز ....

نہ کہا یہ کہ ....

میر کو کیوں نہ ....

صبح سے اور بھی پاتا ہوں ....

خواہ مارا انھیں نے میر کو ....

5- مندرجہ ذیل الفاظ و مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے۔

نمک چھڑکنا، مغتنم، ستم کشتہ، آرزوئے دل، موا۔

(۱۷۸۹ء-۱۸۵۴ء)

شیخ محمد ابراہیم ذوق

دبستان دہلی میں ذوق کے نام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ محمد ابراہیم نام اور ذوق تخلص تھا۔ ایک غریب سپاہی محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حافظ غلام رسول کے مکتب میں تعلیم پائی۔ حافظ صاحب کو شعر و شاعری کا شوق تھا، ذوق بھی شعر کہنے لگے۔ ذوق کو عربی فارسی کے علاوہ متعدد علوم موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔ طبیعت میں جدت تھی۔ تمام عمر شعر گوئی میں بسر کی۔

یوں تو ذوق نے غزل، قصیدہ، رباعی، مخمس وغیرہ مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن ان کی شہرت کا دارومدار غزل اور قصیدہ پر ہے۔ ذوق کی شاعری زبان و بیان کا ایک حسین شاہکار ہے۔ انھیں محاورہ بندی، تراکیب کی چستی اور الفاظ کی تراش خراش میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

(۱)

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو ہو معلوم وقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں تاثیرِ عشق سے
سن کر فغانِ قیس بجائے حُدی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے ہو وہی!
دانش تری نہ کچھ مری دانش وری چلے

(۲)

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمر رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

نہ سمجھو دشت شفاخانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی، دوا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو، اے غافلو قضا سمجھو

نہیں ہے کم زر خالص سے زردیِ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

سوالات

1- ذوق کی شامل نصاب غزلوں میں سے تلمیح تلاش کیجیے۔

2- کلام میں متضاد الفاظ لانے کو صنعت تضاد کہتے ہیں۔ ذوق کا ایسا شعر لکھیے، جس میں صنعت تضاد موجود ہے۔

3- ذوق کا ایسا شعر لکھیے جو ضرب المثل کی طرح استعمال ہوتا ہے۔

4- مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے۔

وقت مرگ، فغان قیس، نقارہ خدا، صدائے پا، زردیِ رخسار، نماز اہل حیات، تاثیر عشق، زر خالص، آمد و شد۔

(۱۸۰۰ء۔۱۸۵۳ء)

مومن خاں مومن

مومن خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام غلام نبی خاں تھا۔ مومن کے دادا سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے اور حکومت سے جاگیر بھی حاصل کی۔ مومن بچپن ہی سے ذہین اور طباع تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا۔ چنانچہ عربی وفارسی، طب، نجوم اور موسیقی میں جلد ہی کمال حاصل کرلیا۔ اصنافِ شاعری میں قصیدہ، رباعی، واسوخت غزل، ترکیب بند، مثنوی سبھی پر طبع آزمائی کی ہے۔ فنِ شعر پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ مومن کی یادگار ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہیں۔

غصہ بیگانہ وار ہونا تھا　　بس یہی تجھ سے یار ہونا تھا

کیا شب انتظار ہونا تھا　　ناحق امیدوار ہونا تھا

کیوں نہ ہوتے عزیز غیر تمھیں　　میری قسمت میں خوار ہونا تھا

مجھ سے جنت میں وہ صنم نہ ملا　　حشر اور ایک بار ہونا تھا

چشم بے اختیار جاناں میں　　کیا مرا اختیار ہونا تھا

صبر کر صبر ہو چکا جو کچھ　　اے دل بے قرار ہونا تھا

کوے دشمن میں جا پکڑتا کیوں　　کیا مجھے شرمسار ہونا تھا

وہ نمک پاش بھی نہیں ہوتے　　یوں ہی دل کو فگار ہونا تھا

رات دن بادہ وصنم مومن
کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

(۲)

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیے ستانے کو

سنگ در سے ترے نکالی آگ
ہم نے دشمن کا گھر جلانے کو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہوگیا زمانے کو

سُن کے وصف اُس پہ مرگیا ہمدم
خوب آیا تھا غم اٹھانے کو

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں
آسمان کے ستم اٹھانے کو

چل کے کعبے میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

سوالات

۱) مومن کی شامل نصاب غزلوں میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجیے۔
۲) دوسری غزل کے پہلے چار اشعار کی تشریح کیجیے۔
۳) مومن کی غزلوں میں درج ذیل تراکیب آئی ہیں، ان کے معنی بتایے؟
سنگ در، صبح عشرت، شام وصال، نمک پاش، شب انتظار، بیگانہ وار

(۱۷۶۴ء۔۱۸۴۶ء)

خواجہ حیدر علی آتش

حیدر علی نام اور آتش تخلص تھا۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن بغداد تھا جو تلاش معاش میں شاہجہاں آباد چلے آئے۔ نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں ان کے والد خواجہ علی بخش ہجرت کر کے فیض آباد چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اس لیے آتش کی تعلیم و تربیت باقاعدہ طور پر نہ ہو سکی۔ لہٰذا مزاج میں شوریدہ سری اور بانکپن پیدا ہو گیا۔

آتش کی شاعری لکھنو میں پروان چڑھی مگر ایک دہلوی استاد مصحفی کے زیر سایہ رہے۔ ان کے زمانے میں لکھنو کی شاعری کی فضا دو حصوں میں تقسیم تھی۔ آتش کی اہم خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا بہترین استعمال ہے۔ روزمرہ اور بول چال کا لطف آتش کے کلام میں بے حد مزہ پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی اُن کی زندگی کا بانکپن پوری آب و تاب سے موجود ہے۔

(۱)

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
تمھارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں گل و لالہ ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشے میں جھومتے ہیں مریدان پیر مغاں کیسے کیسے
عجب کیا چھٹا روح سے جامہ تن لُٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے
بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لُوٹتی ہے زبان کیسے کیسے

(۲)

سُن تو سہی، جہاں میں ہے ، ترا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کہتے ہیں گے کسے تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشت خاک
بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

بے تاب ہے کمال ہمارا دل حزیں
مہماں سرائے جسم کا ہو گا روانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

سوالات

1- آتش کی پہلی غزل کے پانچویں شعر میں ایک تلمیح آئی ہے۔اس کی وضاحت کیجیے۔
2- تشبیہات واستعارات تلاش کر کے لکھیں۔
3- مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے۔
زمین چمن، لالہ وارغواں، پیر مغاں، جامہ تن، اندوہ وحرماں، شوقِ راحت، اسپِ عمر مشتِ خاک، دل حزیں، غم وغصہ
4- آتش کی شامل نصاب غزلوں میں قافیہ اور ردیف کی نشان دہی کیجیے۔

(۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء)

نواب میرزا خاں داغ

پورا نام نواب میرزا خاں اور تخلص داغ ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھ سال ہی کے تھے کہ والد نواب شمس الدین خاں کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے شادی کرلی۔ اس طرح داغ قلعہ معلی میں باریاب ہوئے۔ یہاں داغ کو ذوق سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ داغ کی زبان بنانے اور سنوارنے میں ذوق کا بہت بڑا حصہ ہے۔

داغ کی زندگی تفکرات سے آزاد رہی اس لیے کلام میں سوز و گداز کا عنصر ناپید ہے۔ کوئی فلسفہ نہیں، اس کے بجائے ایک خاص قسم کی شوخی اور چھیڑ چھاڑ کا ذکر ملتا ہے۔ کلام داغ کی سب سے بڑی خوبی زبان ہے۔ صرف اسی ایک خوبی کی وجہ سے بقائے دوام کے مستحق ہیں۔

(۱)

تُو جو اللہ کا محبوب ہوا خُوب ہوا یا نبیؐ خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا
شبِ معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم سخن طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا
حشر میں اُمتِ عاصی کا ٹھکانا ہی نہ تھا بخشوانا تجھے مرغوب ہوا خوب ہوا
تھا سبھی پیشِ نظر معرکہ کرب و بلا صبر میں ثانیِ ایوبؑ ہوا خوب ہوا
داغ ہے روز قیامت مری شرم اس کے ساتھ
میں گناہوں سے جو محجوب ہوا خوب ہوا

(۲)

ہم مٹ گئے تو پُرسش نام و نشاں ہے اب اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب
میں کیا کروں بلا سے جو تو مہربان ہے اب وہ دل کہاں ہے اب وہ طبیعت کہاں ہے اب
ہر گز نہ تھا زمانۂ سابق میں یہ فلک جس آسماں کی دھوم ہے وہ آسماں ہے اب
بے مہر و بے وفا وُ دل آزار و دل ستاں جی ڈھونڈتا ہے جس کو وہ پیدا کہاں ہے اب
کیا کیا ملائے خاک میں انسان، چاند سے سچ پوچھیے اگر تو زمیں آسماں ہے اب
مدت ہوئی کہ داغ کو سنتے تھے سُوئے دَیر
کیا جانے وہ خدائی کا مارا کہاں ہے اب

سوالات

۱۔ داغ کی پہلی غزل کے مقطع کا مفہوم واضح کیجیے۔

۲۔ پہلی غزل کے دوسرے، تیسرے اور پانچویں شعر کی تشریح کیجیے۔

۳۔ اصناف سخن میں ایسے کلام کو جس میں حضورؐ سرور کائنات کے اخلاق واوصاف کا ذکر کیا گیا ہو، نعت کہتے ہیں۔ نصاب میں شامل نعتیہ غزل کے ایک شعر

شب معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم
سخن طالب و مطلوب ہوا خوب ہوا

میں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، وضاحت کیجیے۔

۴۔ پہلی غزل کے ایک شعر میں تلمیح استعمال ہوئی اس کی وضاحت کریں۔

۵۔ مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے:

بے مہر و بے وفا، دل آزار و دل ستاں، نام و نشان، شب معراج، طالب و مطلوب
امت عاصی، پیش نظر، معرکہ کرب و بلا، ثانی ایوب، روز قیامت۔

علامہ اقبالؒ

نوٹ: حالات زندگی حصہ نظم میں دیے جا چکے ہیں۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی   کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو   کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا   وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل   چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

(۲)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تُو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

سوالات

1- پہلی غزل کے تیسرے، پانچویں اور چھٹے شعر کی تشریح کیجیے۔

2- ع رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
اس مصرع میں موجود تلمیح کی وضاحت کریں۔

3- مندرجہ ذیل تراکیب کے معنی بتائیے۔
چراغ سحر، کمال ترک، جزا کی تمنا، نفس غیر، وعدۂ بے حجابی، صبر آزما۔

4- دوسری غزل کے پہلے تین اشعار میں مخاطب کو کن باتوں کی طرف رغبت دلائی گئی ہے؟

5- پہلی غزل کے آخری شعر میں شاعر کس بے ادبی پر معذرت خواہ ہے؟

(۱۸۷۸ء۔ ۱۹۵۱ء)

حسرت موہانی

فضل الحسن نام حسرت تخلص اور لقب رئیس المتغزلین ہے۔ آپ یوپی کے ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے موہانی کہلائے۔ والد کا نام میر اظہر حسن تھا۔ ابتدائی تعلیم موہان میں حاصل کی، بی اے علی گڑھ سے کیا۔ سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی آپ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ حسرت نے طالب علمی کے زمانے ہی سے شعروشاعری میں نام پیدا کرلیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اساتذہ کے دیوانوں کا انتخاب بھی ''انتخاب سخن'' کے نام سے گیارہ جلدوں میں شائع کیا۔ ادبی موضوعات پر تنقید بھی لکھیں سیاسی امور میں آپ کی دلچسپی کا آغاز کالج کے زمانے سے ہی ہو چکا تھا۔

حسرت نے غزل میں سیاست کو ایک مستقل روایت کی حیثیت سے اس طرح شامل کیا کہ غزل کی آبرو کو چار چاند لگ گئے۔ کلام حسرت کی ایک نمایاں خصوصیت اس کی سلاست اور روانی ہے۔ وہ ایک بے باک اور نڈر انسان تھے۔ ہر بات کو بے ساختہ کہنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اردو شاعری میں انھیں ''رئیس المتغزلین'' کہا جاتا ہے۔

(۱)

تجھ سے گرویدہ اک زمانہ رہا
کچھ فقط میں ہی مبتلا نہ رہا

راہ و رسم وفا وہ بھول گئے
اب ہمیں بھی کوئی گلہ نہ رہا

میرے پہلو میں دل رہا جب تک
نظر یار کا نشانہ رہا!

حُسن کا ناز عاشقی کا نیاز
اب تو کچھ بھی وہ ماجرا نہ رہا

ہم بھروسے پر ان کے بیٹھ رہے
جب کسی کا بھی آسرا نہ رہا
آرزو میں تیری برقرار رہے
دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

(۲)

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اِک طُرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی
جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کُھل کھیلو
پَر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی
دشوار ہے رندوں پر ان کا یہ کرم یکسر
اے ساقیِ جاں پَرور کچھ لطف وعنایت بھی
عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خُو نازک
نازک اسی رشتے سے ہیں کارِ محبت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حُرِیّتِ کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید و محبت بھی

سوالات

۱) حسرت کی غزلیات میں سے کوئی ایسا شعر لکھیں جس میں صنعت تضاد موجود ہے۔

۲) حسرت کے ایسے مقطع کی نشاندہی کیجیے، جس میں حسرت کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کا تخلص بھی موجود ہے۔

۳) دوسری غزل کے پہلے تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

۴) مندرجہ ذیل تراکیب کے معنٰی بتایے:

رسمِ وفا، نظرِ یار، مشقِ سخن، لطف وعنایت، حریتِ کامل

حفیظ جالندھری

نوٹ: تعارف نظم حصہ میں دیا جاچکا ہے۔

(۱)

هم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمھیں بھلا سکے
تم ہی نہ سن سکے اگر قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زبان کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے
ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے
رونق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے
عجز سے اور بڑھ گئی برہمیٔ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست، جس کی سمجھ میں آسکے
ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے، جا کے انھیں سنا سکے
اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظؔ درد کے گیت گا سکے

(۲)

ذکر بیداد بتاں پیش خدا کیا ہو گا
زندگی میں نہ ہوا بعدِ فنا ہو گا
حاصلِ عشق ہے رسوائی بھی ناکامی بھی
حاصل عمر نہ جانے ابھی کیا کیا ہو گا
تیری گُفتار بہت تلخ ہے واعظ، یہ بتا
خلد کی پاک شرابوں کا مزہ کیا ہوگا
شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں
ہم یہ سمجھے تھے بجز نامِ خدا کیا ہو گا
بعض نے پھونک دیا گلشن اردو کو حفیظ
آنسوؤں سے تیرے یہ باغ ہرا کیا ہو گا

سوالات

1- حفیظ کی غزلوں کے دوسری غزل کے قافیہ اور ردیف تحریر کیجیے۔

2- حفیظ کی پہلی غزل کے دوسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کیجیے۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی لکھیے اور جملوں میں استعمال کیجیے۔

شرف، بیداد، تلخ، خلد، بجز، گفتار، واعظ، نیازمندی۔

4- غزل نمبر 1 کے پہلے تین اشعار کی تشریح لکھیے۔

فیض احمد فیض

نوٹ: تعارف نظم حصہ میں دیا جا چکا ہے۔

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا
وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا
آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا
فیض تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

(۲)

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہو گی
کب جان لہو ہو گی، کب اشک گہر ہو گا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہو گی
کب مہکے گی فصل گل کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہو گی کب شامِ نظر ہو گی
واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گی
کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامت جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہو گی

سوالات

1- پہلی غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر کی تشریح کیجیے۔

2- فیض کی پہلی غزل کا مطلع لکھیے۔

3- دوسری غزل کا مقطع لکھیے۔

4- مندرجہ ذیل مرکبات کا مفہوم واضح کیجیے۔
تکمیلِ غم، فصلِ گل، صبحِ سخن، شامِ نظر، قامتِ جانانہ، رازِ الفت۔

5- غزل نمبر 2 کے چوتھے شعر کے پہلے مصرع میں واعظ، زاہد، ناصح اور قاتل سے کیا مراد ہے؟
علم بیان کی رو سے ایسے الفاظ کو کیا کہا جاتا ہے؟

(۱۹۲۵ء۔۱۹۷۲ء)

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی انبالہ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آ گئے۔ یہیں باقی عمر بسر ہوئی۔ آپ کا ریڈیو اور ادبی صحافت سے تعلق رہا۔ نشاط خواب، برگ نے، پہلی بارش اور دیوان آپ کے شعری مجموعے ہیں۔

ناصر کی شاعری میں میر کی سی اداسی نظر آتی ہے۔ شہر، رات سفر وغیرہ آپ کے خاص موضوعات ہیں۔ آپ نے روایت سے بغاوت کیے بغیر غزل میں نئی راہیں تلاش کیں۔ وہ آس پاس کی زندگی سے علامتیں اور استعارے لیتے ہیں۔ یہی آپ کی انفرادیت ہے۔

غم عشق اور غم روزگار غزل کا موضوع رہا ہے۔ ہمارے نئے غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی کو اہم مقام حاصل ہے۔ ناصر کو غزل گو بننے میں جس چیز نے بہت مدد دی ہے، وہ ان کے بیان کی سادگی، لچک اور دردمندی ہے۔

یاد آتا ہے روز و شب کوئی
ہم سے روٹھا ہے بے سبب کوئی

لب جو چھاؤں میں درختوں کی
وہ ملاقات تھی عجب کوئی

جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا
وہ بھی تھا موسمِ طرب کوئی

کچھ خبر لے کہ تیری محفل سے
دُور بیٹھا ہے جاں بلب کوئی

نہ غمِ زندگی نہ دردِ فراق
دل میں یونہی سی ہے طلب کوئی

چوٹ کھائی ہے بارہا لیکن
آج تو درد ہے عجب کوئی

جن کو مٹنا تھا، مٹ چکے ناصر
اُن کو رسوا کرے نہ اب کوئی

(۲)

ترے آنے کا دھوکا سا رہا ہے
دیا سا رات بھر جلتا رہا ہے

عجب ہے رات سے آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے

سُنا ہے رات بھر برسا ہے بادل!
مگر وہ شہر جو پیاسا رہا ہے

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آرہا ہے

کسے ڈھونڈو گے ان گلیوں میں ناصؔر
چلو اب گھر چلیں دِن جا رہا ہے

سوالات

۱) ناصر کا مصرع ہے:

"یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے"

اس مصرع میں دریا کس کا استعارہ ہے؟

۲) ناصر کی ایک غزل میں شب، سبب، عجب، طرب، طلب ہم قافیہ الفاظ ہیں۔ دوسری غزل کے ہم قافیہ الفاظ لکھیں:

۳) ناصر کی کسی ایک غزل کا مقطع لکھیے۔

۴) ناصر کی ایک غزل کا مقطع ہے:

کسے ڈھونڈو گے ان گلیوں میں ناصؔر
چلو اب گھر چلیں دن جا رہا ہے

اس غزل کا مطلع لکھیں۔

۵) مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کے معنی لکھیے:

لب جو، روز وشب، موسم طرب، جاں بلب، دردِ فراق، غم زندگی، رسوا، دیا سا۔

فرہنگ

(نوٹ: فرہنگ میں الفاظ کے بالعموم وہی معانی دیئے گئے ہیں جو متن سے مطابقت رکھتے ہیں۔)

1- سرگزشت آزاد بخت بادشاہ کی

ارکان دولت: حکومت کے کارکن

ایک بارگی: یکا یک، اچانک

بدخشاں: پاکستان اور خراسان کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ جہاں لعل پیدا ہوتے ہیں۔

بندی خانہ: قید خانہ

بے بہا: بہت قیمتی

پنڈت خانہ: قید خانہ

خلعت فاخرہ: بیش قیمت لباس، وہ پوشاک جو بادشاہ بطورِ عزت افزائی لوگوں کو عطا کرتے تھے۔

خواصیں: کنیزیں، لونڈیاں، خدمت گار

دروغ: جھوٹ

راہداری: راستے کا محصول، راستے پر چلنے کا اجازت نامہ

سنگ: پتھر

فی الواقع: درحقیقت

قبلہ گاہ: قبلے کی جگہ، مراد ہے والدِ ماجد، بزرگ و برتر

قلم رو: سلطنت، حکومت

گردن مارنا: قتل کرنا

مثقال: ساڑھے چار ماشے کا وزن

محبوس خانہ: قید خانہ

نپٹ: بہت زیادہ، بالکل

نوشت وخواند: لکھنا پڑھنا

نیشاپور: ایران کے ایک قدیم شہر کا نام

یساول: چوکیدار

2- حکایت پسرِ مجسٹن

آخرش: آخرکار

افعی: سانپ، اژدہا

اہلِ دوَل: دولت مند، امیر کبیر

برمحل: موقع پر

بے آب وخورش: بغیر پیئے کھائے

پنسوہی: چھوٹی کشتی

تکان: نیزہ یا برچھی

جاں کنی: جسم سے جان نکلنے کی کیفیت

جودت: ذہن کی تیزی، بات سمجھنے کی طاقت

جورگردوں: آسمان کا ظلم، بدقسمتی

دافع بلیات: بلاؤں کو دفع کرنے والا، کنایۃً خدا تعالیٰ

دہنِ مار: سانپ کا منہ

دیار: ملک، شہر، ٹھکانہ

سخن سنج: خوب باتیں کرنے والا، شاعر، مقرر

سبز قدم: منحوس

شہرِ بے چراغ: سنسان اور اجاڑ شہر

طرفہ: عجیب

طعمہ: لقمہ، نوالہ، خوراک

عاد: ایک قوم کا نام جس کی ہدایت کے لیے حضرت ہودؑ کو بھیجا گیا تھا۔

مرفہ حال: خوش حال
گستردہ: بچھا ہوا
گھاتے: جو چیز مول لی ہو، اس پر کچھ اور بلا قیمت لے لینے کو کہتے ہیں۔
مدام: ہمیشہ
مسن: عمر رسیدہ، بوڑھا
نہنگ و ماہی: مگرمچھ اور مچھلیاں

3- ماما عظمت

آنکنا: اندازہ لگانا
اچاپت: قرض کا لین دین
بالفعل: اس وقت، موجود
بدرویں: گندے پانی کی نالیاں
پھٹکل حساب: چھوٹا، متفرق حساب
توڑا: اشرفیوں یا روپوں کی تھیلی
رہنے کا ٹھیکرا: مکان مراد ہے۔
علی الحساب: بغیر حساب کتاب کیے، اندازے سے
فضیحت: بے عزتی، برائی
کڑاہی: پکوان، پوڑیاں، پکوڑے وغیرہ
کنجڑا: ترکاری بیچنے والا
کوتک: کرتوت، بری عادتیں
کھلے خزانے: اعلانیہ، ڈنکے کی چوٹ
نالش کرنا: مقدمہ دائر کرنا، فریاد کرنا

4- آنگن

تعزیہ: ماتم پرسی، ماتم داری
جم کر رہ جانا: چپک جانا، وہیں کا وہیں رہ جانا

چلچلاتی دھوپ:	کڑی دھوپ، سخت گرم دھوپ
رینگنا:	پیٹ کے بل گھسٹ کر چلنا

5- بدنصیب ماں

اشنان:	غسل کرنا
اَمر:	نہ مرنے والا
امسال:	اس سال
ایشور:	پروردگار، خدا تعالیٰ
بیع کرنا:	فروخت کرنا، بیچ دینا
پچھاڑیں کھانا:	رنج وغم سے گر پڑنا، غم وغصہ سے زمین پر گر کر لوٹنا
دھنا:	دولت مند، امیر
کلسا:	تانبے یا پیتل کا تنگ منہ کا بڑا گھڑا، گاگر
گراں:	بوجھل
لاابالیاں:	بے فکریاں، بے پروائیاں
مسند:	تخت

6- مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

آمنا وصدقنا کہنا:	بجا ہے، درست ہے کہنا
بشاشت:	خوشی
جم غفیر:	بڑا ہجوم
حاذق:	ماہر فن، دانا، کامل
خلقت:	فطرت، عادت
رطب اللسان:	مداح
غریب الوطن:	مسافر، پردیسی، بے گھر
شقی القلب:	سنگدل، ظالم
گنجینہ:	خزانہ

لاینحل: جو حل نہ ہو سکے
مرغانِ خوش نوا: اچھی آواز میں گیت گانے والے پرندے
من جملہ: سب میں سے، تمام میں سے
نحیف و نزار: کم زور، دبلا پتلا، ناتواں
نفرین کرنا: لعنت ملامت کرنا
ہوحق کرنا: شور مچانا

7- بندر والا

آموختہ: سبق، پڑھا ہوا
التفات: توجہ
تامل کرنا: سوچ بچار میں پڑنا
کلفت: رنج، تکلیف، تھکاوٹ
منکسر المزاج: وہ شخص جس کی طبیعت میں عاجزی وانکساری ہو۔

8- گھر سے گھر تک

بوالعجب: عجیب آدمی
پرتو: عکس، جھلک
تھاہ: تہ، گہرائی، انتہا
جھتے: شکنیں، سلوٹیں
دھما کہ چوکڑی مچانا: اچھل کود کرنا
سرزنش کرنا: ڈانٹ ڈپٹ کرنا
عقیق: ایک سرخ رنگ کا قیمتی پتھر
غالیچہ: چھوٹا قالین
مسک جانا: کپڑے کا خفیف سا پھٹ جانا
منقش: نقش کیا گیا، بیل بوٹے دار

9- رستم وسہراب

اجل: موت

پیرہن: اصل لفظ پیراہن ہے، لباس، پوشاک

دلِ پاش پاش: ٹکڑے ٹکڑے دل

فغاں: آہ

قسمت کا بیٹا: قسمت کا مارا ہوا، بدقسمت

قضا: موت، اجل

نہاں: پوشیدہ، چھپا کر

مُہرہ: ایک قسم کا قیمتی پتھر، سیپ، صدف

10- جب اور اب

تشنہ: پیاسا

خوب لتے لینا: خوب خبر لینا

طُرفہ تماشا: عجیب تماشا

فضائے بے کراں: زمین کی بے انتہا کشادگی

11- مرحوم کی یاد میں

ادق: بہت مشکل

عزیمت: پختہ ارادہ

گفت وشنید: کہنا اور سننا، بات چیت

مجمل ہئیت: سرسری شکل وصورت

مخمور: مست، نشے میں چور

12- (ابتدائی سائنس) اردو کی آخری کتاب

آتشِ سیال: بہنے والی آگ، مجاز اُشراب

بحرظلمات: یورپ اور افریقہ کے مغربی سمندر یعنی بحر اوقیانوس کا دوسرا نام

مایع کو مایع ملے کر کر لمبے ہاتھ: دولت، دولت کو کھینچتی ہے۔

کششِ انابیت شعری: وہ قوت جس کے ذریعے مائعات اپنی سطح ہموار سے اوپر چڑھ جاتے ہیں

13- کلیدِ کامیابی

اطفال: طفل کی جمع، بچے

تجزیۂ نفسی: نفس کے ہر جزو کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینا

تحت الشعور: نفس کا وہ طبقہ جو توجہ اور مشاہدے سے باہر ہے۔

کلید: کنجی، چابی

14- بڑے گریما

اکل کھرا: جو دوسروں کو نہ دیکھ سکے، مردم بیزار، بدمزاج

انشراح: کھلنا، کشادہ ہونا

بے نقط سنانا: خوب برا بھلا کہنا، گالیاں دینا

پھیکا سیٹھا: پھیکا اور بدمزہ

دافعِ نفخ: ہوا کو دور کرنے والا

صاحبِ فراش: جو بیمار ہو اور بستر سے نہ اٹھ سکتا ہو

علل: جمع علت کی، وجوہ، اسباب

فمِ معدہ: معدہ کی تھیلی کا منہ

قبلۂ کونین: دونوں جہاں کا قبلہ، مراد ہے باپ

کودن: نادان، کند فہم

کینڈا: نمونہ، پیمانہ، انداز

گوہانجنی: آنکھ کی پھنسی جو پلک کے نیچے ہوتی ہے۔

گھگیا گھگیا کر: بڑی عاجزی کے ساتھ

مزمن: پرانا، کہنہ

مؤید: تائید کرنے والا، مددگار، حمایتی

بلبلا کر بخار چڑھنا: زور سے بخار چڑھنا، ایسا بخار چڑھنا کہ مریض کانپنے لگے۔

15- کاہلی

پھوہڑ: بے سلیقہ، بے تمیز، بے ہنر

پیچواں: حُقہ

طبیعت ثانی: پختہ عادت

قویٰ: قوت کی جمعِ طاقتیں

کاہلی: سستی

مستعدی: ہوشیاری، چستی، تیاری

16- احسانِ عام

افراط وتفریط: گروہ

تصنُّع: بناوٹ، دکھلاوا

دارِ آخرت: آخری جہاں

عفووغفران: درگزر، معافی، بخشش

محاسن: اچھائیاں، خوبیاں، بھلائیاں، نیکیاں

مصحف: الہامی کتاب

مکارم: جمع مکرمت کی، مہربانی، عنایت

مَنفعت: نفع، فائدہ

17- انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

انبوہ: گروہ

بردباری: تحمل، برداشت

بَلّی: لمبا بانس

ترت پھرت: تیزی طراری

جوع البقر: ایک قسم کی بیماری جس میں کھانے کے باوجود شدید بھوک معلوم ہوتی رہتی ہے۔

جھولا: رعشہ، فالج

چکن: سوزن کاری، سوئی کا کام، بیل بوٹے بنا ہوا کپڑا

دودِ آہ: آہ کا دھواں

سقم: خامی، کمزوری

سلطان افلاک: آسمانوں کا بادشاہ یعنی خدا تعالیٰ

عالم ہیولانی: عالم اجسام

عرقِ ندامت: شرمندگی کا پسینہ

قولنج: ایک شدید درد جو پسلیوں کے نیچے ہوتا ہے۔ اپنڈکس

مبادلہ: ادل بدل

18- زبانِ گویا

افترا: بہتان، الزام

افعی: سانپ، اژدھا

بس کی گانٹھ: زہر کی پڑیا

تریاق: زہر مہرہ، زہر کی دوا

تشنیع: لعن طعن، کسی کو برا بھلا کہنا

حنظل: اندرائن کا پھل جو سخت کڑوا ہوتا ہے۔

رفعت: بلندی

زبوں: خراب، تباہ

زیاں: نقصان

سزاوار: مستحق

ضلع جگت: پہلو دار بات جس میں رعایت ہو۔

غماز: چغل خور

کاشف اسرار: بھیدوں کو کھولنے والا

محرم راز: راز جاننے والا

19- اردو ذریعۂ تعلیم

ازمنہ: زمانے کی جمع
اساسی: بنیادی
تفوق: فوقیت دینا
دریوزہ گری: گداگری، بھکاری پن
کفش بردار: جوتی اٹھانے والا
مستثنیات: مستثنیٰ کی جمع، چنے گئے، ماسوا
منطقی: فلسفی

20- نذیر احمد کی کہانی

تکملہ: مکمل کرنے والی چیز
جُبّہ: کرتے کی صورت کا ایک خاص لباس، چغہ
سایہ فگن: سایہ ڈالنا
شالی: شال سے منسوب
صرف ونحو: زبان کے قاعدوں کا علم، قواعد وانشا
مُرمُروں کا تھیلا: مراد ہے موٹا فربہ آدمی
نیم برشت: آدھے اُبلے ہوئے

21- مولانا ابوبکر صاحب

استمزاج کرنا: مرضی پوچھنا، رائے دریافت کرنا
التفات: توجہ
بااین ہمہ: اس کے ساتھ ساتھ
بالاتفاق: اتفاق سے
برگزیدگی: پسندیدگی، مقبولیت
بے آب وگیاہ: پانی اور گھاس کے بغیر، اجاڑ بیابان
پذیرائی: منظوری، قبولیت

دادودہش: فیاضی، شاہ خرچی

دارالاقامہ: ہاسٹل

عندیہ: ارادہ، خیال

کھرّی چارپائی: چارپائی جس پر کوئی کپڑا وغیرہ نہ بچھا ہو۔

مستشرق: وہ فرنگی جو مشرقی علوم اور زبانوں کا ماہر ہو۔

مصالح: مصلحت کی جمع، خوبیاں، اچھائیاں

معاً: اچانک

22- جدّہ - راہِ مدینہ

جارُوب کشی: جاڑو دینا

حاشیہ نشین: پاس بیٹھنے والے لوگ، مصاحب

حُضوری: حضوری میں پیش ہونا

شارع: شریعت لانے والے، پیغمبر

عجلت: تیزی طراری

علی الخصوص: خاص طور سے

قساوت: سنگدلی، بے رحمی

کنگلا: مفلس محتاج، نادار، تنگ حال

لاف زنی: ڈینگیں مارنا

مقتضی: تقاضا کرنا

ہنڈی: وہ رقعہ جو ساہوکار ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیا دینے کے واسطے دیتے تھے

یک شنبہ: اتوار

23- غزنین کا سفر

اقامت گاہ: ٹھہرنے کی جگہ

حدت: تپش

خدّام: خادم کی جمع، ملازمین، خدمت گار

دشت وجبل: جنگل اور پہاڑ

شوفر: موٹر چلانے والا ڈرائیور

مَسکَنت: مسکینی، غریبی، مفلسی، عاجزی

24- قاہرہ

اَماج گاہ: وہ جگہ جس کو نشانہ بنایا جائے، میدانِ جنگ

بے اعتنائی: بے توجہی

خلفشار: گڑبڑ، کھلبلی

ریشم زبان: نرم وملائم زبان، شیریں گفتگو

صبحِ کاذب: صبح کی روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا ہو جاتا ہے

عِظم: غرور، تکبر

کج بحثی: الٹی سیدھی بحث، فضول تکرار

بابلد: ناواقف

نخوت: غرور، گھمنڈ

25- مکاتیب

ا- مرزا غالب

آرزردگی: افسردگی، رنجیدگی، ناخوشی

پاسِ الفت: پیار محبت کا لحاظ

چہار شنبہ: بدھ کا دن

سانحہ: حادثہ، صدمہ پہنچانے والا واقعہ

کھٹکا: ڈر، خدشہ

مربّیہ ومحسنہ: سرپرست اور احسان کرنے والی

معہذا: اس کے ساتھ ساتھ

ب۔ محمد علی ردولوی

امام ضامن: جب کوئی سفر پر جانے لگتا ہے تو گھر والے اس کے بازو پر امام ضامن کا روپیا باندھ دیتے ہیں، جس کو مسافر منزلِ مقصود پر پہنچ کر خیرات کر دیتا ہے۔ روپیا کی تخصیص نہیں دولت مند اشرفی اور مفلس پیسہ ٹکا بھی باندھ سکتے ہیں۔

پنڈا: جسم، بدن

پُرسہ دینا: تعزیت کرنا، کسی کے مرنے کا غم کا اظہار کرنا

صعوبت: دکھ، تکلیف

حصہ نظم

1- عبادتِ صُبح

بیدِ مجنوں: بید کی ایک قسم جس کے پتے باریک اور ٹہنیاں زمین کی طرف جھکی ہوتی ہیں اور اس کی صورت دیوانوں کی سی معلوم ہوتی ہے۔

دوش: کندھا

ذکر: خدا کی یاد میں دل سے سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر، اللہ جل شانہٗ، یا دوسرے الفاظ کہہ کر کرنا

سالک: راہ چلنے والا، سفر کرنے والا، سکول کی منزلیں طے کرنے والا

سَجّادہ: مصلّٰی، جانماز

شَبُّو: ایک پھول جو رات کو مہکتا اور کھلتا ہے، گلِ چاندنی، رات کی رانی

صدائے قمریاں: قمریوں کی آواز

طائرِ شوخ: چہچہاتا پرندہ

کنارِ آب جُو: ندی کا کنارہ

مجذوب: خدا کی محبت میں غرق، صاحبِ جذبہ، مست

مُستعِد: آمادہ، تیار، کمر بستہ

مُصحَف: وہ کتاب جس میں رسالے اور صحیفے جمع ہوں مراد ہے قرآن مجید

نوبت: نقارہ، شادیانہ

یک سُو: ایک طرف، ایک جانب

2- رحمتِ دو جہاںؐ (نعت)

بطحا: وادی مکّہ (لفظی معنی ایسی پتھریلی زمین جو دریا کی گزرگاہ ہو یا گزرگاہ رہ چکی ہو)

شبِ تار: اندھیری رات

غایت اولیٰ: اولین مقصد

یثرب: مدینہ منورہ کا پرانا نام (لفظی معنی خاردار، ویرانہ)

3- مفلسی

تونگر: اصل لفظ تواں گر ہے، مالدار، دولت مند

خاک میں ملانا: خاک میں ملانا، برباد کرنا، خراب کرنا

شمار پڑنا: حساب لگانا

کہاتے ہیں: کہلاتے ہیں

4- کربلا کے صف شکن مجاہد

تشنہ کام: پیاسا

چرخ: ا۔ پھرنے والا، ۲۔ آسمان

خجستہ کام: خوش بخت، نیک کام کرنے والا

ریاض خلد: جنت کے باغات

سرانجام کرنا: انتظام کرنا، بندوبست کرنا

ملک: فرشتے

مہِ منیر: روشن چاند

5- داستان بے نظیر کی

زار و نزار: بہت رونا، آنسوؤں کا تار باندھ دینا

سروِرواں: سیدھے قد والا، مراد ہے خوبصورت

صغیر وکبیر: چھوٹے بڑے

غل: شور، ہنگامہ

غنچہ دہاں: چھوٹے سے منہ والا، مراد ہے حسین وجمیل

گُلِ نوشگفتہ: نیا کھلا ہوا پھول، مراد ہے نوجوان بیٹا

6- شکوہ

پیکرِ محسوس: مادی اور ٹھوس جسم

تابِ سخن: شعر کہلانے والا

جرأت آموز: دلیری سکھانے والی

خاکم بدہن: لفظی معنی میرے منہ میں خاک، یہ جملہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب کسی بڑی ہستی سے کوئی ایسی بات کہی جائے جو تقاضائے ادب کے خلاف ہو۔

خوگر: عادی

زمین بوس ہونا: زمین کو چومنا، سجدہ کرنا

زیاں کار: اپنا نقصان کرنے والا

سود فراموش: نفع بھلا دینے والا

شیوۂ تسلیم: فرماں برداری کی عادت

صفحۂ دہر: زمانے کی کتاب کا صفحہ، زندگی، دُنیا

ہم نوا: دوست

ہمہ تن گوش: پوری طرح متوجہ ہونا

خاک بیچ ملانا: خاک میں ملانا، برباد کرنا، خراب کرنا

7- جوابِ شکوہ

آسمان گیر ہونا: آسمان کو پکڑنا، آسمان تک پہنچنا

پنپنا: پھولنا پھلنا، بڑھنا، نشوونما پانا

شانِ کئی: شوکتِ ماہانہ، کے ایران کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔

شعارِ اغیار: غیر مسلموں کے طور طریقے؛ غیروں کا تمدن

طرزِ سلف: اپنے بزرگوں کا طریقہ

گراں: بوجھل، بھاری

گِل: مٹی

منتظرِ فردا: مستقبل کا انتظار کرنے والا

ہم سخن: ہم زبان، ہم کلام

8- صحرا کی دعا

آبلہ پا: جس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہوں

آتش ناک: سخت گرم، آگ سے بھرا ہوا

سوختہ بختی: بدنصیبی، بدقسمتی

نگہ داری: دیکھ بھال

9- اسلامی مساوات

بندگانِ ذلیل: ادنیٰ درجے کے لوگ

تعیّش: عیش و عشرت

تونگر: اصل تواں گر ہے، مالدار، دولت مند

جز: سوا، بغیر

جوہر: خوبی، ہنر، کمال۔

خالقِ دوسرا: دونوں جہاں کا پیدا کرنے والا

خلدِ جناں: خلد؛ ہمیشہ رہنے والی بہشت، جناں؛ جنت کی جمع

دفتر الٹنا: تباہ ہونا، برباد ہونا

دمِ نزع: جان کنی کی کیفیت، مرنے کے قریب ہونا

سمور: برفانی جانوروں کی کھال کا لباس (سمور دراصل لومڑی کی جسامت کا ایک برفانی جانور ہے۔

عقبیٰ: اگلا جہاں، دوسرا جہاں، آخرت

فصلِ خزاں: خوراک اور روٹی

قوت وناں: باریک ریشمی کپڑا

کمر بستہ: کمر باندھے ہوئے، آمادہ، تیار

گل فشاں: پھول بکھیرنے والا

مسخ: بگاڑ، اچھی صورت بدل کر بری صورت ہو جانا، بگڑا ہونا

مفلوک: تباہ حال، خستہ خراب، مفلس

نوعِ بشر: انسانوں کی قسم، مراد ہے عالمِ انسانیات

ہادی: ہدایت دینے والا

ہوا و ہوس: حرص، طمع، خواہشِ نفسی

10- رباعیات

بادہ نوشی: شراب پینا

تکبیر: اللہ اکبر کہنا

جم: جمشید شاہِ ایران کا مخفف، بڑا بادشاہ

خود بینی: خود پسندی، غرور، تکبّر

سخن فروشی: باتیں بیچنا، فکر و خیالات کی فروخت

عجم: عرب کے سوا کوئی اور ملک، ماسوا عرب

لحد: قبر

مَلَک: فرشتہ

11- اے وطن

آن: عزت، شرم، لاج

اقبال: خوش قسمتی، خوشحالی، عروج

دھن: دولت، مال اسباب

نذر دینا: تحفہ دینا

12- دعوتِ عمل

پیمان: عہد
تعصب: جلاپا، بے جا حمایت
زیست: زندگی
شعار: طور طریقہ، چلن
غمِ دوراں: زمانے کا غم
محل: موقع، جگہ، ٹھکانا
نکوکار: اچھے افعال کا مالک

13- شہیدوں کا لہو

تابش: گرمی، حرارت، تپش
تادیب: ادب سکھانا، ڈانٹ ڈپٹ کرنا
تجلی: روشنی، چمک
تعزیر: سزا دینا
تعطیر: خوشبو، مہک
حریت: آزادی
قصرِ مستقبل: مستقبل کا ایوان
مشیّت ایزدی: تقدیر، قسمت

14- ایک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

بہرِ عنوان: مضمون وغیرہ کی سرخی دینے کے لیے
عبث: فضول، بے فائدہ، بے وجہ
لاؤ لشکر: تمام سامان، تمام لوگ
مع: ساتھ، ہمراہ
ملّت بیضا: مراد ہے مسلمان قوم
نفوس: نفس کی جمع، لوگ، انسان

غزلیات

1- خواجہ میر درد

ادراک وفہم: عقل اور سمجھ
ارض وسما: زمین اور آسمان
تن افگار: زخمی جسم
دلِ ریش: زخمی دل
دوئی: دو ہونے کی کیفیت، دو سمجھنا، توحید کی ضد
زینہار: ہرگز
فتادہ: اصل لفظ افتادہ ہے یعنی گرا ہوا، بے کس، مجبور
معین: مقرر، طے شدہ
ولے: لیکن

2- میر تقی میر

اغماض: چشم پوشی، روگردانی، بے توجہی
بیگانگی: پرایا پن
تند: تیز، سخت، غضب ناک
جفا: ظلم
ستم کشتہ: جو ظلم سے مر جائے
مجروح: زخمی
مغتنم: غنیمت

3- شیخ محمد ابراہیم ذوق

قضا: موت
ناقہ: اونٹنی
حدی: ساربانوں کا گیت جس کو سن کر اونٹ مست ہو کر تیز چلتا ہے۔

آمد وشد: آمد و رفت

کیمیا: تانبے یا چاندی کو سونا بنانا

4- مومن خاں مومن

بیگانہ وار: غیروں کی طرح، بے توجہی کے ساتھ

جا: جگہ

صنم: کسی چیز کا بنایا ہوا قالب، بت، محبوب

عذر: بہانہ، معذرت

فگار: زخمی

کوئے دشمن: دشمن کا کوچہ

نمک پاش ہونا: نمک چھڑکنا

5- خواجہ حیدر علی آتش

آستانہ: دروازہ، بارگاہ

ارغواں: ایک سرخ رنگ کا خوشنما پھول

اندوہ: رنج، غم، فکر

بلند بام: اونچی چھت

پیر مغاں: آتش پرستوں کا پیشوا، مرشد، بزرگ

تازیانہ: چابک، چھچی

حرماں: مایوسی، ناامیدی، بدقسمتی

دارا: ایران کا وہ بادشاہ جو سکندر اعظم سے شکست کھا گیا تھا۔

دلِ حزیں: غمگین دل

زر بکف: سکندر اعظم جو یونان کا بادشاہ اور فاتح عالم تھا۔

قارون کا خزانہ: روایت ہے کہ قارون حضرت موسیٰ کے زمانے میں ایک مالدار مگر انتہائی کنجوس شخص تھا۔ جس کے ہاتھ کہیں کا پارس کا پتھر آ گیا۔ جس کی وجہ سے اس نے سونے چاندی اور جواہرات کا ڈھیر اکٹھا کر لیا

تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی بددعا سے وہ اپنے زرو جواہر سمیت زمین میں دھنس گیا تھا۔

مشتِ خاک: مٹھی بھر خاک، مراد ہے انسان

مہمیز: ایڑ لگانا

6- نواب میرزا خان داغ

پرسش: پوچھ گچھ

خدائی کا مارا: تباہ و برباد و رسوائے زمانہ

دل ستاں: دل لے جانے والا، دل ربا، خوبصورت

دیر: بت خانہ

عاصی: گناہ گار

محجوب: حجاب کیا گیا، مخفی

مرغوب: رغبت کیا گیا، پسندیدہ

7- علامہ اقبالؒ

آہ و فغاں: آہ و زاری، نالہ و فریاد

بے حجابی: بے پردگی، بے تکلفی

تہی: خالی

چراغ سحر ہونا: مرنے کے قریب ہونا

لن ترانی: تو مجھے کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ (خدا کا وہ حکم جو انھوں نے حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر کہا تھا۔)

8- حسرت موہانی

تغافل: جان بوجھ کر غفلت کرنا، بے توجہی

جورِ خزاں: خزاں کے موسم

گرویدہ: عاشق، فریفتہ

نیرنگی: نئے نئے رنگ، جادوگری

9- حفیظ جالندھری

بجز: سوائے
برہمی مزاج: طبیعت کا بگاڑ
بیدار: ناانصافی، ظلم
عجز: عاجزی، انکساری
نامہ بر: پیغام بر، قاصد

10- فیض احمد فیض

تکمیلِ غم: غم کو مکمل کرنا، پورا دکھ
دیدۂ تر: روتی ہوئی آنکھ
شنوائی: توجہ دینا، دھیان دینا
فصلِ گل: موسمِ بہار
گہر: موتی

11- ناصر کاظمی

دن جانا: دن گزرنا، دن ڈھلنا
لبِ جو: نہر کے کنارے
موسمِ طرب: خوشی کا زمانہ

امتحانی پرچے کا خاکہ - نمبروں کی تقسیم

(بمطابق نصاب اُردو اختیاری برائے جماعت نہم ودہم 2002
وزارتِ تعلیم، قومی شعبہ نصاب، حکومت پاکستان اسلام آباد)

حصہ نثر	۳۵
حصہ نظم	۳۵
قواعد	۳۰
☆ دیے گئے اقتباس کی سیاق وسباق کے حوالے سے تشریح	۱۰
☆ اسباق پر سوالات	۱۰
☆ سبق کا خلاصہ	۵
☆ مصنفین پر نوٹ	۵
☆ افسانے/ڈرامے کے کرداروں پر نوٹ	۵
☆ نظم کی تشریح	۱۰
☆ غزل کی تشریح	۱۰
☆ نظم کا خلاصہ	۱۰
☆ شعرا پر نوٹ	۵
☆ شعری اصطلاحات کی تعریف	۱۰
☆ مضمون نگاری	۲۰

تمت بالخیر

فرمانِ قائدِ اعظمؒ

اسلام ہر مُسلمان کے لیے ضابطہ حیات بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرّہ زندگی اپنے اعمال وافعال حتیٰ کہ سیاست، معیشت اور زندگی کے تمام شعبوں میں بھی عمل پیرا ہوتا ہے۔

(۲۵۔ جنوری ۱۹۴۸ء کراچی بارایسوسی ایشن سے خطاب)



اپیل

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آپ کا اپنا ادارہ ہے جووفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان سے منظوری کے بعد قومی نصاب کے مطابق معیاری اور سستی کتب تیار کر کے مہیا کرتا ہے۔ ان کتب کے ذریعے اسلامی اقدار، ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اور زندگی کی دیگر جہات سے آگاہی اور شعور کو اجاگر کیا جاتا ہے۔

یہ کتابیں کہنہ مشق ماہرین تعلیم سے لکھوائی جاتی ہیں۔ اگر ان کتب میں کوئی تصور وضاحت طلب رہ گیا ہو تو یقیناً اساتذہ کرام اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں۔ امسال حکومت پنجاب کی خصوصی ہدایت پر تمام کتب کو اغلاط سے مبرّا بنانے کے لیے نظرثانی کروائی گئی ہے۔ متن اور تصاویر کو بہتر بنایا گیا ہے۔ تاہم مزید بہتری اور اصلاح کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے لہٰذا اساتذہ، طلبہ و طالبات، والدین اور دیگر ماہرین تعلیم سے گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کے بارے میں بذریعہ ڈاک یا دیئے گئے ٹیلی فون نمبروں میں سے کسی بھی نمبر پر مندرجہ ذیل حوالوں سے اپنی آرا سے آگاہ فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن کو مزید بہتر بنایا جا سکے۔

- املا کی غلطیوں کی نشاندہی
- تصاویر اور نقشوں کی بہتری کے لیے تجاویز
- مواد کی غلطیوں کی نشاندہی
- مختلف اسباق کی بہتری کے بارے میں تجاویز

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں بورڈ کے مونوگرام سے پہچانی جاتی ہیں جو ہر کتاب کے سرورق پر طبع ہوتا ہے۔ طلبہ وطالبات ان نصابی کتب کے علاوہ دیگر کتب (خلاصہ جات، ٹیسٹ پیپرز اور گائیڈز وغیرہ) خریدنے کے قطعاً پابند نہیں ہیں۔

ڈائریکٹر انسانیات — فون نمبر: 9230685

ڈائریکٹر ٹیکنیکل — فون نمبر: 9230683

سیکرٹری — فون نمبر: 9230681

فیکس — نمبر: 9230679

سلیم اختر کیانی

چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ،

21-E-II، گلبرگ-III، لاہور

قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سرزمین کا نظام قوتِ اُخوتِ عوام
قوم ملک سلطنت پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد

پرچمِ ستارہ و ہلال رہبرِ ترقّی و کمال
ترجمانِ ماضی شانِ حال جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

247

تاریخ اشاعت	تجرباتی ایڈیشن	طباعت	تعداد	قیمت
اپریل 2005ء	اول	اول	2000	30.00